اسلامی علوم و تحقیقات اور زبان و ادب کا ترجمان ماہنامہ

جلد: ۰۴، شمارہ: ۰۴، جمادی الاخریٰ ۱۴۴۳ھ، جنوری ۲۰۲۲ء

النخیل کراچی

بانی

ابن الحسن عباسی رحمۃ اللہ علیہ

ادارہ تراث الادب کی مطبوعات
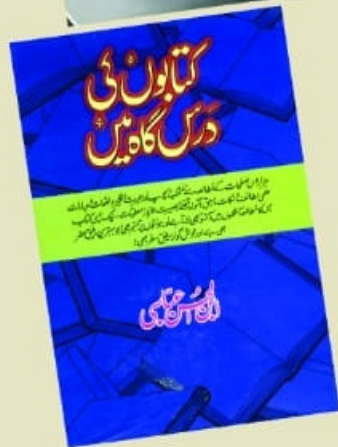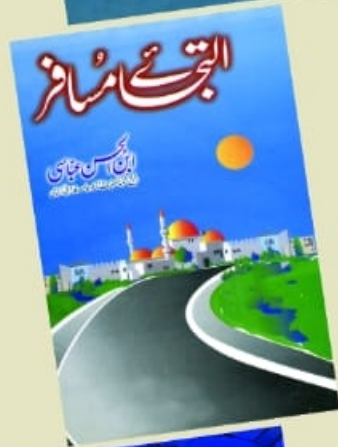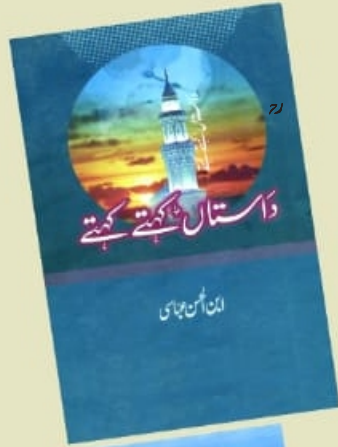
رابطہ نمبر: 03004097744-03444023470

اسلامی علوم وتحقیقات اور زبان وادب کا ترجمان ماہنامہ

جلد: ۰۴، شمارہ: ۰۴، جمادی الاخریٰ ۱۴۴۳ھ، جنوری ۲۰۲۲ء

ادارہ تراث الادب

alnakhil786@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فی شمارہ:.... 60روپے **سالانہ زرِتعاون :**.... 600 روپے

خط و کتابت کا پتہ:.....ادارہ تراث الادب، ۰۷/ دس آر، آریہ نگر، خانیوال

رابطہ نمبر:.......... 03004097744-03444023470

ای میل ایڈریس:alnakhil786@gmail.com

صدائے نخیل

تہذیبوں کی جنگ۔۔۔حقیقت یا واہمہ؟

مدیر کے قلم سے

سائنس وٹیکنالوجی کی حیرت انگیز اور خیرہ کن ترقی نے جہاں آج کے دور میں بنی نوع انسان کے لیے زندگی کی بہت سی آسانیاں پیدا کی ہیں اور آج کا انسان ماضی کے مقابلے میں مادی اور جسمانی لحاظ سے زیادہ آسودہ حال لگتا ہے، وہیں ساتھ ہی اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ آج کی دنیا میں انسانیت کی بقاء کے لیے خطرات بھی افزوں تر ہو گئے ہیں اور یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ آج اکیسویں صدی میں بھی کرۂ ارض پر انسانی طبقات کے درمیان جنگوں، خانہ جنگی، تصادم، کشیدگی اور اس کے نتیجے میں وسیع تباہی کے مناظر ومظاہر بھی جا بجا دیکھے جا رہے ہیں۔ اس خونی منظر نامے میں یہ سوال ہر باشعور انسان کے ذہن کو دستک دیتا ہے کہ آخر اس تباہی و بربادی کا سبب کیا ہے اور وہ کیا عوامل ہیں جو انسانیت کے مختلف طبقات کے درمیان تصادم اور روئے زمین پر کشت وخون کا باعث بنتے ہیں۔ اس سوال کا جواب ہر زمانے کی طرح اس دور کے مفکرین اور دانشوروں نے بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں مختلف تصورات اور نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں ایک مقبول نظریہ ''تہذیبوں کا تصادم کا نظریہ'' ہے جو امریکی دانشور سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے نوے کی دہائی کے آغاز پر پیش کیا۔ تہذیبوں کے درمیان تصادم محض کوئی واہمہ یا پروپیگنڈا نہیں ہے بلکہ ایسے عوامل اور اشارے موجود ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ دنیا میں اس وقت جو انتشار اور خلفشار ہے ،اس کے پیچھے دنیا پر مخصوص تہذیب کو مسلط کرنے کی کوشش بھی ایک بڑا عنصر ہے جو اس تہذیب کے علم برداروں کی طرف سے مسلسل کی جا رہی ہے۔

سابق سویت یونین اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کے درمیان کئی دہائیوں پر محیط سرد جنگ جب بظاہر اپنے نظریاتی مرحلے سے نکل کر عسکری مرحلے میں داخل ہوئی تو کئی عالمی دانشوروں نے اسے

''نظریے کے خاتمے''end of idioligy سے تعبیر کیا۔ان کے نزدیک قدیم نظریاتی کشمکش اپنی موت مرگئی اور مغربی طاقتیں روئے زمین کی گویا تنہا فکری ونظریاتی وارث ورہبر بن کر سامنے آگئیں۔پھر جب اسی کی دہائی کے آخر میں سویت یونین بکھر گیا تو ان دانشوروں نے اسے ''تاریخ کے خاتمے''end of hostor سے تعبیر کرنا شروع کیا۔ان کے نزدیک دنیا میں ایک ہی نظریہ یعنی سرمایہ داریت پر مبنی مغربی نظریہ کامیاب ہوگیا، دنیا میں قدیم نظریاتی کشمکشیں ختم ہوگئیں اور مغرب کا نظریہ ہی نیا ''ورلڈ آرڈر'' بن گیا مگر اسی دوران ایک امریکی سائنسدان سیموئیل پی ہٹگٹن نے یہ تہذیبوں کے تصادم کا تصور پیش کیا اور اس کے لیے کئی شواہد اور شارے پیش کیے۔

تہذیبوں کے تصادم(Civilization Clash of) نظریہ بنیادی طور پر مشہور امریکی سکالر فوکویاما کے مقالے اینڈ آف ہسٹری کے جواب میں پیش کیا گیا۔سوویت یونین کے ٹوٹنے کے کچھ عرصہ بعد جاپانی نژاد فوکویاما نے جو ہارورڈ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے، تاریخ کا اختتام(End of History)کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جس نے عالمی میڈیا میں تہلکہ مچا دیا۔فوکویاما کا کہنا تھا کہ کمیونزم کی شکست کے بعد اب مغربی تہذیب اور فکر کا غلبہ یقینی ہوگیا، اب کوئی اور تہذیب اس کے مقابلے میں نہیں بلکہ سب اسی مغربی تہذیب، مغرب اور مغربی قدروں کی پیروی کریں گی۔

اس مقالے کے دوڈھائی برس بعد ایک اہم امریکی جریدے فارن افیئرز میں فوکویاما کے ایک اُستاد اور ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سمیوئیل پی ہنٹنگٹن کا مقالہ "تہذیبوں کا تصادم" شائع ہوا، بعد میں اس پر ان کی کتاب تہذیبوں کا تصادم......اور ورلڈ آرڈر کی تجدید نو (Clash of Civilization and Remaking of World Order) شائع ہوئی۔ پروفیسر ہنٹنگٹن نے فوکویاما کی تھیوری کورد کرتے ہوئے کہا: ''اگرچہ یہ درست ہے کہ اب دنیا میں نظریات کا تصادم نہیں ہوگا مگر یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی غلط ہوگا کہ مغرب کی جمہوریت اور سیاسی نظام ہی سب کے لیے قابل قبول ہوگا۔''ہنٹنگٹن کے بقول اب دنیا میں تصادم اور کشمکش کا بنیادی سبب ثقافتی (کلچرل) اختلاف ہوگا۔ پروفیسر ہنٹنگٹن نے دنیا کو چھ سات مختلف تہذیبوں میں تقسیم کیا اور ہر تہذیب کی خصوصیات کا ذکر کیا تاہم ان کے مطابق اصل مقابلہ مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے درمیان

ہونا ہے۔ پروفیسر ہنٹنگٹن اپنی کتاب میں مختلف اعداد و شمار پیش کر کے لکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ایک دو مسلمان ملک ہی آزاد تھے مگر اب پچاس سے زیادہ مسلمان ملک آزاد ہو چکے ہیں۔ ان کی آبادی بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اگرچہ ان میں مختلف نسلی (عرب، کرد، ایرانی، بنگالی، پاکستانی وغیرہ) اور لسانی اختلافات موجود ہیں مگر اپنی مسلم تہذیب اور عقیدے کے اعتبار سے وہ سب یک جان اور متحد ہی ہیں۔ چین کی غیر معمولی تیزی سے پھیلتی اور فروغ پاتی معیشت بھی مغرب کے لیے بڑا خطرہ ہے۔

پروفیسر ہٹنگٹن کے اس نظریے کو سازشی نقطہ نظر سے دیکھنے والے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں اور ایسے لوگوں کا ماننا ہے کہ تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ دراصل دنیا میں خوف کی سیاست کے ذریعے ہتھیاروں کی تجارت بڑھانے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست بھی ہو سکتی ہے مگر اس سے مغربی تہذیب اور اسلام کے درمیان تصادم کے امکانات کی نفی نہیں ہوتی۔ یہ سچ ہے کہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں تصادم کی وجوہ فروعی نہیں بلکہ اصولی نوعیت کے ہیں۔ اسلامی تہذیب خدا پرستی، روحانیت، انسان دوستی، سادگی، تقوی اور خوف آخرت کی اقدار کی بات کرتی ہے اور اسلام کی نظر میں انسان اپنے اعمال و افکار میں وحی الٰہی کی تعلیمات کا پابند ہے اور وہ زمین میں اللہ کے نائب کی حیثیت سے تصرفات کرنے کا مجاز ہے۔ جبکہ جدید مغربی تہذیب خالص مادی فلسفے پر مبنی ہے اور اس میں انسان کو ہی کائنات کا مرکز و محور مانا گیا ہے۔ مغربی تہذیب مابعد الطبعیات پر یقین نہیں رکھتی اور اس کی نظر میں انسان کسی ماورائی طاقت کا پروردہ و پابند نہیں ہے۔ وہ ہر طرح سے آزاد و خود مختار ہے اور اسے کسی روحانی یا اخلاقی پابندی کی ضرورت نہیں ہے۔

اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے درمیان کشمکش کا اگر تاریخ کے آئینے میں جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلامی تہذیب نے اپنے اثر و نفوذ کے لیے کبھی عسکری طاقت کو مدار نہیں بنایا بلکہ اسلام اپنی اخلاقی طاقت کے ذریعے ہی دنیا کے تین براعظموں پر راج کرتا رہا۔ ایک ہزار سال اسلامی تہذیب دنیا میں حکمران رہی لیکن مسلمانوں نے کسی دوسری قوم کو تہذیبی و معاشی غلام نہیں بنایا لیکن گزشتہ تین سو سال کے عرصہ میں اس سیکولر مغربی تہذیب نے پوری دنیا کی

اقوام کو اپنا تہذیبی غلام بنالیا ہے، انہیں ہر جگہ اپنا لباس اور اپنی ہی زبان نظر آنی چاہیے اور پوری دنیا کے وسائل کو ہتھیانے کے لیے سود پر مبنی استحصالی معاشی نظام کے ذریعے سیکولر مغربی تہذیب نے عالمی مالیاتی غلامی کا نظام مسلط کر رکھا ہے جس میں ہر ملک وقوم کے ہاتھ پاؤں اور گردنیں بری طرح جکڑ دی گئیں، اور اب نئی صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اس تہذیب نے دفاعی غلامی، تعلیمی غلامی اور تیکنیکی غلامی سمیت نہ معلوم کس کس طرح کی غلامیوں کے جال انسانوں پر پھیلا رکھے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلامی تہذیب اور سیکولر مغربی تہذیب کے درمیان کشمکش کے جوہری اسباب موجود ہیں اور موجودہ گلوبل دنیا میں جبکہ مشرق ومغرب کے درمیان فاصلے سمٹ چکے ہیں اور تہذیبیں ماضی کی طرح اپنی اپنی جغرافیائی حدود میں محدود نہیں رہ سکتیں، ان کے درمیان بقا کی جنگ ناگزیر ہے۔ اس وقت مغربی تہذیب کو مادی ترقی اور جدید عسکری ٹیکنالوجی کی برتری حاصل ہے لیکن یہ تہذیب اعلیٰ انسانی اقدار، روحانی اور اخلاقی تعلیمات سے عاری ہونے کی بنا پر اندر سے کھوکھلے پن کا شکار ہے جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اس تہذیب کے مراکز میں ایک بھونچال برپا ہے اور سالانہ ہزاروں کی تعداد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ وتہذیب یافتہ لوگ اسلام کی پناہ میں آرہے ہیں، باوجود اس حقیقت کے کہ مسلمان دنیا میں ہر جگہ ظلم وجبر سے دوچار ہیں۔

دوسری جانب اسلامی تہذیب کے پاس ایک عالم گیر نظام حیات کے طور پر اپنے آپ کو منوانے کے لیے تمام وسائل میسر ہیں مگر عالم اسلام کا المیہ یہ ہے کہ وہ باہمی انتشار وخلفشار کے فتنے میں مبتلا کر دیا گیا ہے اور اس کے لازمی نتیجے کے طور پر سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ گیا ہے حالانکہ دنیا کی امامت کے لیے روحانی اور مادی دونوں میدانوں میں برتری رکھنا ناگزیر ہے۔ اس لیے تہذیبوں کی جنگ میں فتح یابی کے لیے امت مسلمہ کو اپنی صفوں میں ایمان، اتحاد، نظم وضبط اور قوت ارادی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ جدید علوم وفنون کے میدان میں بھی آگے بڑھنا ہوگا اور مغربی تہذیب کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ جہت پیش قدمی کرنا ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہمارا حامی وناصر ہو۔

محمد شفیع چترالی

۲۰ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۳ھ

آہ جگر دوز

ابو کی قبر پر۔۔۔!

سعود الحسن عباسی

[بانی النخیل مولانا ابن الحسن عباسی رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے صاحبزادے محترم سعود الحسن عباسی گزشتہ برس انتہائی کم عمری میں اپنے عظیم والد کے سائے سے محروم ہو گئے، اپنے ابو کی یاد میں ان کا یہ مضمون کسی بھی رسالے میں آپ کی طرف سے پہلا مضمون ہے، آپ کے مضامین النخیل کی زینت بنتے رہیں گے، ان شاءاللہ۔ ادارہ]

ابو کو رخصت ہوئے ایک سال اور ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا، ان کی وفات کا صدمہ ابھی بھی ایسے ہی محسوس ہوتا ہے جیسے پہلے دن ہوا، سینے سے ایک ٹیس اٹھتی ہیں اور دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ یہ وقت ہمارے لیے کیسے کوہِ گراں ثابت ہوا، الفاظ میں سمونا مشکل ہے، ابو نے دادی اماں کی وفات کے بعد ایک جگہ اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا، وہی ہماری کیفیت ہے:

> آج میں ایک عرصے بعد والدہ کی قبر پر گیا اور اسے دیکھ کر بہت آبدیدہ ہوا...... ماں کی جدائی کے غم پر بہت کچھ لکھا گیا اور بہت کچھ لکھا جائے گا لیکن مصر کے اس یتیم بچے کا ایک جملہ ہزار مرثیوں پر بھاری ہے، جس نے امتحان کے کسی پرچے میں ابھی دو چار برس پہلے لکھا تھا: "أمي ماتت، و مات معها كل شيئ" میری ماں مرگئی اور اس کے ساتھ ہر چیز مرگئی۔" ماں جی! ہر چیز مرگئی ہے، سب رشتے بجھ گئے ہیں، آپ کے جانے کے بعد!"

ابو کی قبر پر حاضری کے وقت یہی حال میرا ہوتا ہے، صبر کا حکم نہ ہوتا تو پھوٹ پھوٹ کر روتا، اُنہیں حالِ دل سناتا: ابو! ہم تو ابھی بہت چھوٹے تھے، ربیع اور وکیع جو مجھ سے بھی کئی سال چھوٹے ہیں، ہم سب کو آپ کا ساتھ چاہیے تھا، آپ سے بہت کچھ سیکھنا تھا، آپ کی گود جس میں سر رکھ کے لیٹنا ہمیں ہر چیز

سے عزیز تھا، آپ کی انمول باتیں جو ہیروں سے زیادہ قیمتی ہوتی تھیں، آپ کی بے مثال اور لازوال محبت یہ سب اب ہمیں کہاں ملے گی، آپ نے ہمیں تنہا چھوڑ کر اس ویرانی میں آکر ڈیرہ لگایا بھی تو ہمیں کس کے سہارے چھوڑ کر۔ اب ہم اپنے درد بانٹیں تو کس سے؟ ابو آپ ہمارے صرف والد ہی نہیں، ہمارے مربی بھی تھے، ہمارے شفیق استاذ بھی تھے، ہمارے لیے سائبانِ شفقت تھے، گھنا سایہ دار و پھل دار درخت تھے، غموں اور تکلیفوں سے ڈھال تھے۔ کوئی کیسے سمجھ سکتا ہے ہم نے کیا کھویا ہے:

مجھ کو چھاؤں میں رکھا اور خود بھی وہ جلتا رہا
میں نے دیکھا اک فرشتہ باپ کی پرچھائیں میں

ابو کی وفات کا سانحہ بھائیوں میں بڑا ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ میرے لیے تکلیف دہ تھا، جس روز اُن کا انتقال ہوا یوں لگا کہ اماوس کی کالی سیاہ اندھیری رات جس میں آسمان بھی کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا ہو، میری کشتی دریا کے عین درمیان بیچ گرداب کے پھنس گئی ہو۔ میں کئی دن سکتے کی کیفیت میں رہا، نہ کسی سے بات کر پاتا، نہ کسی کا جواب دے پاتا، چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھا رہتا، کچھ خبر نہ تھی کہ کون آیا کون گیا۔ چند دن کے بعد جب سب عزیز واقارب گھروں کو لوٹ گئے تو والدہ میرے پاس آکر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں: بیٹا تین دن سے آپ کی یہ حالت دیکھ رہی ہوں، دیکھو وہ آپ کے ابو تھے تو میرے بھی تو سَر کا تاج تھے، اگر آپ اسی طرح رہے تو میں کیسے جی پاؤں گی، اب آپ ہی گھر کے بڑے ہو، بڑے بھائی کی حیثیت سے اب گھر تو آپ نے ہی سنبھالنا ہے، اگر آپ کی یہی حالت رہی تو چھوٹوں کو تسلی کون دے گا، یہ کہہ کر وہ رو دیں اور میرا بھی دل بھر آیا اور میری آنکھیں بھی برسنے لگیں۔

ابو کی یادیں ذہن کے نہاں خانے میں محفوظ ہیں، ان پر شائع ہونے والی النخیل کی خصوصی اشاعت میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا جائے گا، چند باتیں جو ابھی نوکِ قلم پر آنے کو ہیں، تحریر کیے دیتا ہوں:

☆......ابو جنہیں ہم نے جب سے ہوش سنبھالا، پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں مشغول پایا، اپنا ایک لمحہ بھی ضائع کرنا انہیں گوارا نہیں تھا لیکن اس سب کے باوجود ان کی ہماری تعلیم وتربیت پر خاص توجہ رہتی تھی، وہ اپنی تصنیفی وتدریسی مصروفیات میں کبھی اس سے غافل نہیں ہوئے، ہم بہن بھائیوں کو مسنون دعائیں یاد کراتے، آداب سکھاتے، چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کراتے رہتے۔

☆......آپ قرآن مجید کے حافظ اور بہترین قاری تھے، قرآن مجید عمدہ قرأت کے ساتھ پڑھتے تھے، نماز میں یا نماز کے علاوہ جب بھی قرآن مجید کی بلند آواز سے قرأت کرتے تو ایک سماں باندھ دیتے، آپ نے مجھے بھی بڑے اہتمام سے قرآن پاک حفظ کروایا، آپ کو جس طرح قرآن مجید کی تلاوت کا خاص ذوق تھا، ہم سے قرآن مجید سننے کا بھی شوق تھا، یہاں تک کہ ہمارے چھوٹے بھائی جن کی عمر چند سال تھی، انہیں بھی آخری سورتیں زبانی یاد کرائیں، وہ جب بھی آپ سے پیسے مانگتا، آپ پہلے وہ سورتیں سنتے، پھر انعام کے طور پر انہیں پیسے دیتے۔

☆......ابو کو تدریس سے کس قدر دلچسپی تھی، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، ابو گھر پر ہوں (جو کہ اکثر ہوتے تھے) اور صحت بھی ٹھیک ہو تو سبق کا ناغہ نہیں کرتے تھے، آپ کی تدریس کے انداز اور خصوصیات کو آپ کے کئی تلامذہ نے قلم بند کیا جو خصوصی اشاعت کا حصہ ہوں گے، یہاں یہ ذکر کرنا چاہ رہا ہوں کہ جب ۲۰۲۰ء میں کورونا لاک ڈاؤن ہوا تو مدارس سمیت تمام تعلیمی ادارے بند ہو گئے، اس کی وجہ سے ہم سب بھائی بہن بھی گھر پر ہی ہوتے تھے، ابو نے گھر پر ہی تعلیمی سلسلہ شروع کر دیا، آپ نے سب گھر والوں کو جمع کر کے مشکوٰۃ شریف کا درس دینا شروع کیا، عبارت پڑھنے کی ذمہ داری میری ہوتی تھی، بہت علمی نکات بیان فرماتے تھے۔

☆......آپ اہلِ علم کے بڑے قدردان تھے، دارالعلوم کراچی میں اپنے اساتذہ سے ملاقات کے لیے تشریف لے جاتے تھے، آپ کو مفتی زرولی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بہت محبت تھی، رات میں دیر تک ان کے بیانات سنتے رہتے تھے، لاک ڈاؤن کے دوران (جولائی ۲۰۲۰ء میں) آپ ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے، یہ ملاقات ایک علمی مجلس کی صورت اختیار کر گئی اور دیر تک جاری رہی۔ اس دوران اہلِ علم بہت تیزی سے اٹھ رہے تھے، دونوں حضرات اس پر بے حد رنجیدہ تھے، بارہا اس پر دکھ کا اظہار کیا کہ پاک و ہند کے کئی اہلِ علم اس عرصے میں وفات پا گئے۔ کیا معلوم تھا کہ یہ دونوں شخصیات بھی ایک ہفتے کے فرق سے (۱) میں اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو جائیں گی۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون... غفر اللہ لھما و أسکنھما فسیح جناتھما**

---

(۱) مفتی زرولی خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ۷ دسمبر ۲۰۲۰ء کو ہوا جبکہ مولانا ابن الحسن عباسی رحمۃ اللہ علیہ ۱۴ دسمبر ۲۰۲۰ء کو وفات پا گئے۔ (ن م)

علم وتحقیق

کلامِ الٰہی، اسلوب اور طرز بیان

مولانا محمد اسلام قاسمی

استاذ حدیث وادب دار العلوم وقف دیوبند

خالق کائنات نے کائنات کی تخلیق کی، زمین وآسمان بنائے، ان دونوں کو مختلف مخلوقات سے سجایا، پھر کائنات ارضی کو آباد کرنے کے لیے آدم اور بنی نوع آدم کی تخلیق کی، جب دنیا کو حضرت آدم علیہ السلام اور حواء کے ذریعہ آباد کرنے کی ابتدا ہوئی تو ابلیس نے اپنی برتری کے زعم میں آدم اور بنی نوع آدم کی افضلیت سے انکار کردیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں ان کو گمراہ کردوں گا، خالق ارض وسماء سے بغاوت اور نافرمانی پر آمادہ کروں گا، اللہ نے فرمادیا کہ جو تمھارے بہکاوے میں آیا وہ گمراہ ہوگا، سخت عذاب کا مستحق ہوگا، اور جو میرے بتائے ہوئے طریقے پر چلے گا، میرے احکام کی پابندی کرے گا وہ باعزت وکامران ہوگا، انسان کو اس کی ہدایت اور رہنمائی کرتا رہوں گا۔

چنانچہ اللہ رب العزت نے جب دنیا آباد کی تو دنیا میں بسنے والے انسانوں کے لیے ان میں سے ہی بعض افراد کو ہدایت کے لیے مامور ومبعوث فرمایا، یہ افراد اللہ کے برگزیدہ بندے تھے، جو نبی اور رسول کے لقب سے جانے جاتے ہیں، ان پیغمبروں کو وحی، الہام اور دیگر ذرائع سے راہِ ہدایت کی رہنمائی کی گئی اور انسانوں میں ان تعلیمات کو عام کرنے نیز خالق کائنات کی عبادت کی جانب دعوت دینے کی ذمہ داری عائد کی گئی۔ پھر ان انبیاء میں سے بہت سے افراد کو باضابطہ صحیفے اور کتابیں عطا کی گئیں جن میں رشد و ہدایت کے سارے پیغامات درج تھے، ان کی روشنی میں وہ دعوت وتبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہے، یہ کتابیں اور صحیفے سب اللہ کا کلام ہیں، الٰہی فرمان ہیں، اس کا ناطق رب کائنات ہے، ان ہدایات کے الفاظ ومعانی سب خالق کون ومکاں کے ہیں، کسی نبی یا مخلوق کے

نہیں۔ ان تمام کتابوں میں معروف ترین: زبور، توریت، انجیل اور بعض دیگر صحیفے ہیں، مگر اللہ کی آخری کتاب قرآن کریم ہے، جو نبی آخرالزماں پر نازل کی گئی۔

اس سے پہلے جن رسولوں کے صحیفے اور کتابوں کا ذکر خود قرآن کریم میں موجود ہے، ان میں سے بہت سے صحیفوں کا وجود مٹ گیا، جن آسمانی کتابوں کا وجود پایا جاتا ہے، ان کے بارے میں قرآنی حقائق اور تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ اصل حالت میں نہیں ہیں، ان میں تحریف ہوگئی، متعلقہ قوموں نے اس میں تبدیلیاں کردیں یا انجیل جیسی مقدس کتاب کی اصل موجود نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، بلکہ ان کے حواریوں نے بہت بعد میں از خود تحریر کر کے اسے انجیل یا بائبل کا نام دے دیا۔ البتہ قرآن پاک میں گذرے انبیاء پر نازل شدہ آسمانی کتابوں یعنی الہامی صحائف کا ذکر موجود ہے اور ان پر اس بات کا ایمان رکھنا ضروری ہے کہ وہ اللہ کی کتابیں رہی ہیں۔

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد پانچ سو سال تک اللہ کا کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا اور نہ آسمانی کتاب باقی رہی، اس وجہ سے بھی پوری دنیا میں گمراہی، شرک اور کفر کا دور دورہ رہا۔ ایمان کی روشنی ختم ہوئی، اللہ کی عبادت نایاب ہوگئی تو کائنات غیر ایمان کی تاریکی میں ڈوب گئی۔ مگر اللہ رب العزت نے انسانوں کی ہدایت کا سلسلہ ابھی ختم نہیں کیا تھا، اس لیے اب ایک ایسے رسول کی بعثت ہوئی جو تمام انبیاء کی خوبیاں اور صفات لیے ہوئے تھے اور یہ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس ہے جو بلاد عرب میں مبعوث ہوئی۔ ان سے قبل جتنے انبیاء یا رسل دنیا میں بھیجے گئے ان کی زبان غیر عربی تھی، جزیرۃ العرب میں پہلی مرتبہ آخری نبی مبعوث ہوئے۔

عرب دنیا جیسا کہ تاریخی واقعات وحقائق سے معلوم ہوتا ہے بذات خود کوئی حکومت یا حیثیت نہیں رکھتی تھی، اس لیے یہاں تہذیب وتمدن، قانون وانتظام، شعور واحساس، اجتماعی معاشرہ اور اس کے لوازمات کا کوئی حصہ ان کی زندگی یا تہذیب میں نہیں تھا، ان کے یہاں عربی میں شعر وسخن اور خطابت وبلاغت کا وافر حصہ موجود تھا، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعثت کے بعد جب دعوت الی اللہ کے لیے اہل مکہ کو آواز دی تو انھیں عجیب لگا، اور رفتہ رفتہ جب ان مشرکین مکہ کو بتایا گیا کہ یہ خالق کائنات کا حکم ہے اور انھیں اللہ کا کلام بھی سنایا گیا۔ جب قرآن کریم کی آیتیں ان کے سامنے آئیں تو

وہ حیرت میں پڑ گئے، ان ماہرین عربی زبان و مالکان فصاحت و بلاغت کے سامنے ایک نیا لہجہ، نیا آہنگ اور نیا اسلوب سامنے آیا، ورنہ تو بیشتر نے یہ سمجھا تھا کہ یہ نبی کا اپنا کلام ہے اور جب کسی عربی النسل کا کوئی عربی اسلوب ہو، اس کو پرکھنے اور جانچنے کے لیے ان کی قادرالکلامی کافی تھی، مگر قرآنی اسلوب، فصاحت و بلاغت کے اس اعلیٰ معیار پر ان کی عقلیں حیران و پریشان اور زبانیں خاموش تھیں، یہ خاموشی ٹوٹی تو کہتے نظر آئے کہ یہ جادو ہے یا کسی کاہن کا کلام، بہتوں نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ اس طرح کا کلام تو ہم بھی تیار کر سکتے ہیں۔ ایسے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ انسانی قدرت کی چیز نہیں، یہ تو خالق کائنات، معبود حقیقی اللہ کا کلام ہے، تم اس طرح کی عبارتیں تو کیا لا سکتے ہو، اس طرح کی ایک ادنیٰ سی سورت یا چند آیتیں بھی پیش نہیں کر سکتے۔ تمام سربراہان زبان و آداب کو چیلنج کر دیا گیا کہ اس جیسی کوئی سورت لا کے دکھاؤ۔

اب قرآنی اسلوب اور الٰہی طرز بیان کا اثر شروع ہوتا ہے۔ قرآن صرف عربی زبان کا مجموعہ نہیں تھا، یہ خالق و مالک کائنات کا اسلوب تھا جس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے نطق و بیان کا سلیقہ عطا کیا، سمجھنے کے لیے عقل دی اور قبول کرنے کے لیے دل دیا، چنانچہ جب عربی زبان کے مالک و ماہر افراد نے سنا، غور کیا اور جائزہ لیا تو اس طرز بیان نے دل و دماغ کو متأثر کیا، دین میں داخل ہونے لگے، مزاج کی تیزی، سرکشی اور بغاوت ابھی کلّی طور پر احکامِ اسلام کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھی، اس لیے انسانی فطرت کے مطابق، مخلوق دل و دماغ کی وسعت اور قبول پذیری کے مطابق اللہ رب العزت نے اپنے کلام سے پہلے انھیں مانوس کیا، متأثر کیا اور سخت دلوں میں نرمی پیدا کی، قبول کرنے کی صلاحیت کے مطابق انھیں دین کی دعوت دی، عبادت، معبود اور ہدایت و کامرانی کا مفہوم سمجھایا۔

اس طرح قرآن کریم بیک وقت کسی کتاب کی صورت میں نازل نہیں ہوا، بلکہ ۲۳ سال کے طویل عرصے اور مکہ و مدینہ کے مختلف مقامات میں رفتہ رفتہ اس کی سورتیں نازل ہوتی رہیں۔ یہ کوئی روایتی کتاب نہیں تھی جس میں ابواب و فصول ہوں اور عنوانات قائم ہوں، یہ کسی مخلوق کی تصنیف نہیں تھی، جس کا انداز بیاں یکساں ہو، اسلوب ایک ہو اور تمام چیزیں مرتب ہوں، یہ اللہ کا کلام تھا، انسانیت کے لیے ہدایت کا ذریعہ، دنیا کے لیے ایک کامیاب نظام، عقیدے کے لحاظ سے ایک

دینِ متین اور قیامت تک کے لیے ناقابل تغییر و تسخیر احکام و علامات، اس لیے قرآن کریم کے اسلوب پر جب غائرانہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ الگ الگ اوقات اور الگ الگ مقامات کے لیے علیحدہ انداز بیان ہے۔

مختصر طور پر اگر ہم قرآن کریم کی سورتوں اور آیتوں کا جائزہ لیں تو اس کو ہم دو دور میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک مکی دور اور دوسرا مدنی دور--- تیرہ سال کا زمانہ مکی زندگی پر مشتمل ہے اور دس سال مدنی زندگی کے ہیں۔ جو سورتیں اور آیتیں ہجرت سے قبل کی ہیں وہ مکی سورتیں کہلاتی ہیں خواہ وہ مکہ میں نازل ہوئیں یا کہیں اور، اسی طرح ہجرت الی المدینہ کے بعد جو سورتیں نازل ہوئیں، وہ مدنی سورتیں کہلاتی ہیں خواہ مدینہ میں نازل ہوئیں یا مکہ اور اس کے اطراف میں۔ اس طرح دونوں یعنی مکی اور مدنی سورتوں کا اندازِ بیان، تخاطب اور موضوع قطعی جداگانہ ہیں۔

مکی سورتوں میں عام طور پر مشرکین کو ترغیب کے انداز میں دعوت دی گئی ہے، سہل انداز، مختصر عبارتیں اور مؤثر طرزِ بیان پر مشتمل، ان میں زیادہ تر دین و وحی، خدا کی قدرت و رحمت، حشر و نشر، مناظر قیامت، تخویف مشرکین، اخروی باز پرس، ثواب و عقاب، دین کی اصولی وحدت، دعوتِ اسلام کی ہمہ گیری، سابقہ اقوام کے اقوال، انبیاء سابقین اور ان کی امت کے حالات، نافرمانیوں کی سزا، عبرتناک انجام جیسے مضامین کا احاطہ ہے اور یہ وہ مضامین ہیں جو دلوں کو جھنجھوڑتے ہیں، دماغوں کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں، سرکش قوتوں کو سرنگوں کرتے ہیں۔ چونکہ ابھی دلوں میں کفر ہے، طغیانی ہے، سرکشی ہے، قدرت باری تعالیٰ کے وجود سے ناآشنائی ہے، گمراہی ہے، تاریکی ہے، اس لیے ابھی ضرورت ہے کہ بڑی نرمی کے ساتھ خوبصورت پیرائے میں ان کو سوچنے، سمجھنے اور ماننے کے لیے متوجہ کیا جائے، اس لیے عبارت بھی خوبصورت، انداز لطیف، طرز تخاطب نرم اور مختصر مختصر آیتوں کے ذریعہ کانوں کو مانوس کیا جائے، دماغ کو متأثر کیا جائے اور دلوں کو قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے، چنانچہ باری تعالیٰ نے ابتدائی مرحلے میں اپنے کلام میں یہی اسلوب رکھا، کفار کو اس کے ضد و عناد سے ہٹا کر ان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا کام کیا، ان میں نیکی کے خوابیدہ جذبات کو ابھارا گیا، ان کو بتایا گیا کہ کائنات کے حسین و جمیل مناظر کو آنکھیں کھول کر دیکھیں اور ان سے خالق کائنات کو پہچاننے کی

کوشش کریں، آسمان میں سورج، چانداور ستاروں پر نظر ڈالیں، ان کے حرکات وسکنات دیکھیں اور زمین میں بلند وبالا پہاڑ، ان کی ہیبت ناکی، ہریالی، فصلیں انواع واقسام کے پھل اور پھول، رنگ و خوشبو، سمندر کا پانی، اس کی طغیانی، بارش اور اس کے ثمرات، یہ سب اشیاء ایک خالق ومالک کا پتہ دیتی ہیں، وہی ہر چیز میں حرکت دیتا ہے یا سکوت، وہی زندگی دیتا ہے یا موت، ہر ایک کا مرجع اسی کی ذات، ہر ایک اسی کی قدرت کا آئینہ۔

پھر خواب غفلت سے جگانے اور کفر وشرک سے دور کرنے کے لیے قرآن نے اس مکی دور میں بڑا انوکھا اسلوب اختیار کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کے واقعے سے لے کر تمام بڑے انبیاء اور ان کی امت کا تذکرہ کیا ہے۔ پیغمبران خدا نے کس کس طرح لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی اور قوموں نے کس طرح حجت بازی کی، نافرمانی کی اور کن عقابوں اور عذابوں کا شکار ہوئے۔

حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی کشتی کا قصہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا واقعہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی تفصیل، حضرت شعیب، حضرت زکریا، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت صالح و ہود علیہم السلام کے واقعات اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور ان کا پیغام، یہ تمام واقعات عبرت انگیزی کے لیے اور اثر پذیری کے لیے زیادہ تر مکی سورتوں کا موضوع ہیں۔

اور جب کفار نے توجہ دی، اور ان کے دلوں میں ان باتوں کا اثر ہوا تو وہ دعوت توحید ورسالت پر ایمان لائے، یا ان کے دلوں میں ان قرآنی تذکیر وہدایت نے اثر کیا اور مائل بہ اسلام ہوئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے، یہاں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہوئی، رفتہ رفتہ پورا جزیرۃ العرب حلقہ بگوش اسلام ہوا تو اب قرآن کریم کا اسلوب اور انداز بیان بدلا، اب ترغیب کے ساتھ ترہیب، ایمان لانے والوں کے لیے احکام شریعت، عبادات ومعاملات اور دیگر قوانین کا اجرا، مسائل کا بیان، جرم وسزا، عہد وپیمان اور مؤمنانہ زندگی گذارنے کے اصول وآداب بیان کئے جانے لگے۔ اس طرح مدنی سورتوں میں احکام وعبادات، امر ونہی اور قوانین شریعت کا بیان اہم موضوع ہے، اور یہاں بھی اسلوب بیان میں خشک زبان نہیں بلکہ ادبیانہ انداز ملحوظ ہے۔

☆......☆......☆

کتابیں ہیں چمن اپنا

فتاویٰ وَلْوَالِجِیّة

مفتی محمد ساجد میمن

[” کتابیں ہیں چمن اپنا“ اس عنوان کے تحت ہر ماہ اسلامی علوم کے بنیادی مصادر و مراجع میں سے کسی ایک اہم کتاب کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ادارہ]

کچھ مصنف کے بارے میں:

آپ کا نام عبدالرشید بن ابوحنفیہ۔لقب:......ظہیر الدین۔کنیت:......ابوالفتح ہے۔ ولوالج کی طرف نسبت ہونے کی بناء پر آپ کو’’ولوالجی‘‘ کہتے ہیں۔

’’وَلْوَالِج‘‘(واو کے فتحہ اور لامِ ثانی کے کسرہ کے ساتھ) بدخشان کی ریاست ہے جو کہ بلخ اور طخارستان کے عقب میں واقع ہے۔یعقوب حمویؒ فرماتے ہیں:

’’وأحسب أنها مدينة مزاحم بن سبطان وإليها ينسب أبوالفتح الوالجی‘‘۔(۱)

ولادت: جمادی الاولیٰ ۴۶۷ھ میں ولوالج میں آپ کا ورودِ مسعود ہوا۔

ابتدائی تعلیم و اساتذہ کرام: ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی ، اس کے بعد مزید حصولِ علم کے لیے مختلف مما لک کا سفر کیا۔ابوبکر قزاز محمد بن علی اور علی بن حسن برہان بلخی سے بلخ میں اور امام ابومحمد محمد بن ایوب قطوانی سے سمرقند میں فقہ کی تعلیم حاصل کی، پھر بخارا تشریف لے گئے اور

امام صدر شہید سے علم فقہ حاصل کیا۔ سمعانی کہتے ہیں: ''کہ آپ نے امام ترمذیؒ کی ''شمائل ترمذی'' ابوقاسم خلیلی سے ۴۹۱ھ میں پڑھی ہے۔''

شمائل وعادات: آپ کی عادات وشمائل کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ سمعانی کہتے ہیں:

''لقيته و سمعت منه ،و كان إمامًا فقيها فاضلًا حنفي المذهب حسن السيرة''۔(۲)

یعنی ''میری ان سے ملاقات ہوئی ہے اور میں نے ان سے سماع بھی کیا ہے، آپ مذہب حنفی کے فقیہ، امامِ فاضل اور حسن سیرت کا نمونہ تھے۔''

وفات: آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں مختلف اقوال ہیں:

(۱)......۵۴۰ھ۔ (۲)......۵۴۱ھ۔ (۳)...... یاقوت حموی فرماتے ہیں: ''لاأدري متى مات''۔(۳)

آثارِ علمیہ: آپ کی دو تصنیفات کا ذکر ملتا ہے: (۱)...... إمالی (۲)...... فتاویٰ ولوالجية، اس وقت یہی کتاب ہمارے زیر تعارف ہے۔(۴)

مصنفِ فتاویٰ کی بابت ایک غلط فہمی کا ازالہ: کتاب کے مصنف کی بابت بعض حضرات کو غلط فہمی ہوئی ہے، حاجی خلیفہ نے کشف الظنون: (۵) میں ''فتاویٰ ولوالجیه'' کا مصنف اسحاق بن ابی بکر ولوالجی متوفی ۷۱۰ھ کو قرار دیا ہے۔ طبقات سنیه(۶)، تاج التراجم(۷) اور أعلام (۸) میں بھی یہی قول مذکور ہے۔

اس کے برخلاف دوسرا فریق ہے جس نے اس کتاب کا مصنف علامہ عبدالرشید ولوالجی کو قرار دیا ہے۔ علامہ لکھنویؒ نے ''الفوائد البهية''(۹) میں، علامہ ابوالوفاء نے ''الجواهر المضية'' (۱۰) میں اور بغدادی نے ''هدية العارفين''(۱۱) میں اسی قول کو ذکر کیا ہے۔

علامہ لکھنوی ''الفوائد البهية'' میں فرماتے ہیں:

''قال صاحب الكشف :الفتاوى الولوالجية لظهير الدين أبي المكارم إسحاق بن أبي بكر الحنفي المتوفى سنة عشرة و سبع مائة، أوّلها: الحمد

للّٰہ جعل العلم حجۃ الإسلام۔۔۔ وفیہ خطأ من وجوہ عدیدۃ''۔(۱۲)

علامہ لکھنویؒ نے ان مختلف وجوہات کا تذکرہ نہیں کیا، بلکہ ان کی طرف صرف اجمالاً اشارہ کردیا ہے،غوروفکر کے بعد جو چند وجوہات سامنے آئیں، ذیل میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

(۱)......اسحاق بن ابوبکر کی شخصیت غیر معروف ہے، نہ ان کے اساتذہ کا پتہ ہے، نہ تلامذہ کا اور نہ ہی ہم عصروں کا، چند باتیں کشف الظنون (۱۳) میں حاجی خلیفہ نے ان کے متعلق ذکر کی ہیں۔

(۲)......اس کتاب میں جن مشایخ کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، وہ ۵۴۰ھ سے قبل کے ہیں اور ۵۴۰ھ کے بعد کے حضرات مشایخ کی کتابوں سے استفادہ نہیں کیا گیا، اگر اس کتاب کا مصنف اسحاق بن ابوبکر کو قرار دیا جائے تو ان کی وفات ۷۱۰ھ کی ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۵۴۰ھ کے بعد کے مشایخ کی کتب سے استفادہ کرنے میں ان کے لیے کیا چیز مانع اور رکاوٹ بنی؟؟

(۳)......عبدالرشید ولوالجی کے ہم عصر اور اساتذہ میں صدر شہید، ابومحمد قطوانی، ابوقاسم خلیلی، برہان بلخی وغیرہ حضرات ہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ مصنف کا زمانہ ۵۴۰ھ کا ہے، نہ کہ ۷۱۰ھ کا۔ اگر مصنف کو ۷۱۰ھ کا قرار دیا جائے تو مذکورہ حضرات سے ہم عصریت کیسے ثابت ہوگی؟؟

(۴)......مصنفؒ کا سماع صدر شہیدؒ (متوفی ۵۳۶ھ) سے ثابت ہے، خود مصنفؒ نے اپنی اس کتاب میں دو جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے۔

نمبر(۱):...... کتاب القضاء کی فصل ثالث میں۔(۱۴)

نمبر(۲):...... کتاب القضاء کی فصل رابع میں۔(۱۵)

مقدمہ کتاب میں اسی بات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وکان الشیخ۔۔۔ الصدر۔۔۔ أشد الناس اهتماماً۔۔۔ بتحریرہ۔۔۔ فاتفق لخادمه المربوب فی برہ وإنعامه أن یفصل ما أوردہ فی کتابه تفصیلاً''(۱۶)

ان تمام دلائل سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب کے اصل مصنف عبدالرشید ولوالجی ہیں، کیوں کہ جب

ان کا سماع شیخ صدر شہیدؒ سے ثابت ہے تو صدر شہیدؒ کی وفات ۵۳۶ھ کی ہے......لہٰذا اسحاق بن ابی بکر کو مصنف قرار دیا جائے تو صدر شہیدؒ سے ان کا سماع کیسے ثابت ہوگا؟

مصادر ومراجع کتاب: اس کتاب کی تدوین وتالیف میں مصنفؒ نے جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے ان کا تذکرہ مصنفؒ نے خود مقدمہ میں کر دیا ہے، فرماتے ہیں:

''وأن يضم إليه ما اشتملت عليه كتب الإمام محمد بن الحسن رحمه الله مما لابدّ من معرفته لأهل الفتوىٰ من قضايا الدين وأحكام الهدى ليكون كتاباً جامعًا لأصول الفقه وقواعده''......(۱۷)

اس کے علاوہ جن کتب سے مصنف نے استفادہ کیا ہے، تحقیق ومطالعہ کے بعد درج ذیل کتب سامنے آئیں:

(۱)...أدب القاضي: ابوجعفر طحاوی علیہ الرحمۃ(۲)...مبسوط: ابوسهيل سرخسی علیہ الرحمۃ (۳)...الكافي: حاكم شهيد علیہ الرحمۃ (۴)...المنتقىٰ: حاكم شهيد علیہ الرحمۃ (۵)...مختصر العصام: صدر شهيد علیہ الرحمۃ (۶)...مختصر الطحاوي (۷)... مختصر القدوري (۸)... مختصر الكرخي(۹)...شروح الزيادات (۱۰)... نوادر هشام (۱۱) ...نوادر ابن سماعة (۱۲)...نوادر رستم (۱۳)...واقعات الناطفي(۱۴)...فتاوىٰ صدر شهيد علیہ الرحمۃ، صغرىٰ وكبرىٰ۔

مصنف کا اسلوب وانداز: سب سے پہلے ''کتاب'' کا عنوان قائم کرتے ہیں، پھر مسائل کو فصول میں تقسیم فرما کر ان فصول کی تعداد اجمالاً ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد ہر ہر فصل کے مسائل کو الگ الگ ذکر کرتے ہیں، مثلاً: **كتاب الطهارة... هذا الكتاب (المبارك) اشتمل على أربعة عشر فصلاً:**

الفصل الأول: فی الحياض، والآبار...الفصل الثاني: فی النجاسة التي تصيب الثوب والبدن... الفصل الأول : فی الحياض والآبار وغيرذلک، أما الحياض:...الخ

چنانچہ اسی فقہی طرز پر مصنف نے ''کتاب الطهارة'' سے ''کتاب الفرائض'' تک یہ کتاب مرتب کی ہے۔

پیش نظر نسخہ: اس وقت ہمارے پیش نظر ''دار الکتب العلمیہ بیروت، لبنان'' کا شائع کردہ نسخہ ہے، جس پر تحقیق کے فرائض ''شیخ مقداد بن موسیٰ فریوی'' نے سرانجام دیئے ہیں۔ یہ نسخہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کی ابتداء میں الشیخ خلیل المسیس (مفتی زحلة والبقاع ومدیر ازہر لبنان) کی تقریظ بھی شامل ہے۔ کتاب کی ابتدا میں محقق نے ایک مختصر سا مقدمہ لکھا ہے، جس میں ''فتاویٰ اور صاحب فتاویٰ'' کا تعارف ہے۔

بوقت تحقیق محقق کے پیشِ نظر چار نسخے تھے:

(۱)...... ''مکتبۃ الاسد الوطنیہ اور مکتبہ ظاہریہ دمشق'' میں موجود نسخہ جو ۶۱۶۲ نمبر کے تحت مندرج ہے۔ یہ فتاویٰ ولوالجیہ کا مکمل مخطوطہ ہے، بقول محقق کے کہ اس میں بہت کم غلطی ہے اور بہت کم جگہوں پر عبارت رہ گئی ہے، اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ''أ'' کا رمز استعمال کرتے ہیں۔

(۲)...... یہ مخطوطہ مکتبۃ الاسد میں ۸۲۹۷ نمبر کے تحت مندرج ہے۔ یہ نسخہ ناقص ہے، ابتدا سے لے کر کتاب الھبہ کے آخر تک ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے محقق ''ب'' کا رمز استعمال کرتے ہیں۔

(۳)...... یہ مخطوطہ مکتبۃ الاسد میں ۸۳۰۲ نمبر کے تحت مندرج ہے۔ یہ نسخہ بھی ناقص ہے۔ کتاب البیوع سے اخیر تک ہے۔ کتاب البیوع سے قبل کا حصہ غائب ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ''جـ'' کا رمز استعمال کرتے ہیں۔

(۴)...... یہ مخطوطہ جامعہ ام القریٰ میں ۳۰ نمبر کے تحت درج ہے، یہ دراصل فوٹو کاپی ہے۔ اس کا اصل نسخہ مکتبہ احمد الثالث میں ۸۳۷ نمبر کے تحت مندرج ہے۔ اس نسخہ کی ابتدا کتاب البیوع کی عبارت ''هذا الكتاب اشتمل على عشر فصول......'' سے ہوتی ہے اور کتاب کے اختتام تک موجود ہے۔ اس کی طرف ''د'' کے رمز سے اشارہ کرتے ہیں۔

فاضل محقق نے کتاب کی تحقیق وتعلیق میں درج ذیل امور کا اہتمام کیا ہے:

(۱)......نسخوں کے درمیان تقابل کیا ہے اور ان کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے۔

(۲)......قرآنی آیات کے حوالے پیش کئے ہیں اور انہیں ممتاز کرنے کے لیے پھول دار قوسین {......} میں ذکر کیا ہے۔

(۳)......احادیث مبارکہ کی تخریج کی ہے اور انہیں بھی ممتاز کرنے کے لیے ڈبل قوسین ((......)) میں ذکر کیا ہے۔

(۴)......کتاب میں مذکور اعلام کا تعارف ذکر کیا ہے۔

(۵)......علاماتِ ترقیم لگانے کا بھی اہتمام کیا ہے۔

کتاب میں بعض جگہ فارسی اصطلاحات بھی ذکر ہیں۔ ان کی تعریب یا کسی قسم کی وضاحت نہیں کی گئی، اس بارے میں محقق اپنا عذر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ومما صعب عليّ عمله في هذا السفر الضخم، ترجمة المصطلاحات الفارسية التي لم استطع ترجمتها، وقد عرّضتها على بعض الفارسين إيرانيين و عراقيين، فقالوا لي: بأنها لغة قديمة وهي مندثرة فلاحول ولاقوة الا بالله العلي العظيم۔“(۱۸)

حوالہ جات

(۱)(معجم البلدان:۵/ ۳۸۴،دارالفکر، بیروت)......(۳)(معجم البلدان:۵/ ۳۸۴)...... (۴)(الفوائد البھیۃ،ص:۹۴، الجواھر المضیۃ:۱/ ۳۱۳، کشف الظنون :۲/ ۲۲۰، الأعلام: ۳/ ۳۵۳ حدائق حنفیہ، ص:۲۴۶)(۵)(۲/ ۲۲۰)......(۸)(۱/ ۲۹۴)......(۹)(ص:۹۴) ......(۱۰)(۱/ ۳۱۳) ...... (۱۲)(الفوائد البھیۃ: ۹۴)......(۱۶)(مقدمۃ الکتاب:۱/ ۲۷،دارالکتب العلمیۃ، بیروت)...... (۱۷)(مقدمۃ الکتاب:۲۸)......(۱۸)(مقدمۃ التحقیق:۱/ ۱۴)

کارِ جہاں بینی

سوشل میڈیا کا ریشمی جال

ڈاکٹر شاہد صدیقی

وقت کے ساتھ ساتھ مختلف ایجادات نے ہماری زندگیوں میں بہت سی آسائشیں پیدا کر دی ہیں۔ ہمارے اردگرد اشیاء کی بہتات ہوگئی ہے لیکن اس سارے عمل میں غیر محسوس طور پر ہماری شخصی آزادی ختم ہونے لگی ہے اور اس کی جگہ کارپوریٹ کی منطق نے لے لی ہے۔ اپنے طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی مرضی میں آزاد ہیں لیکن دراصل ایک ایسے معمول کے طور پر کام کر رہے ہوتے ہیں، جس کی ڈوریاں بڑی بڑی کارپوریشنز اور کمپنیوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں، جن کا مقصد زیادہ سے زیادہ منافع کمانا ہے۔ نیولبرل ازم کے فلسفے پر استوار ان کمپنیوں کی پہلی اور آخری ترجیح پیسہ ہے۔ اس سارے عمل میں اقدار (Values) کو جان بوجھ کر پسِ پشت ڈالا جاتا ہے۔ اس سارے عمل میں دلچسپ مگر تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ہم برضا ورغبت اپنے آپ کو استحصال کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اس کی تازہ ترین مثال سوشل میڈیا کی ہے جس کے ریشمی جال نے ہمیں اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اس ریشمی جال کے مختلف ناموں سے کئی چھچھاتے رنگ ہیں۔ حال ہی میں انٹرنیٹ پر ایک ڈاکومنٹری The Social Media Dilemma نے سوشل میڈیا کے اثرات اور اس کے پسِ پردہ عزائم کو بے نقاب کیا ہے۔

اس سے پہلے کہ سوشل میڈیا کے اثرات پر بات کریں ہمیں اس ماڈل کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس کے نتیجے میں یہ کمپنیاں انسانی تاریخ کی امیر ترین کمپنیاں بن گئی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سوشل

میڈیا کے استعمال کے لیے کوئی فیس نہیں لی جاتی تو پھر یہ پیسہ کہاں سے آتا ہے؟ اس سوال کا آسان جواب یہ ہے کہ ایڈورٹائزرز ان کمپنیوں کو پیسے دیتے ہیں۔ اس کے بدلے میں یہ کمپنیاں کیا چیز بیچتی ہیں؟ یہ ہے وہ بنیادی سوال جس کا جواب ہمیں پوری بحث کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ ایڈورٹائزرز یہ چاہتے ہیں کہ ان کی مصنوعات زیادہ سے زیادہ فروخت ہوں، اس کے لیے انہیں کمپنیوں سے یقین دہانی چاہیے ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی مصنوعات تک پہنچ کر انہیں خریدیں گے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ سوشل میڈیا کمپنیاں ممکنہ گاہکوں کے حوالے سے پیشگوئی کر سکیں۔ اچھی اور معتبر پیشگوئی اسی صورت ممکن ہے جب ڈیٹا تک رسائی ہو۔ جتنا زیادہ اور مستند ڈیٹا ہوگا اتنی ہی قابلِ اعتماد پیش گوئی ہوسکتی ہے۔ اس عمل میں پہلا مرحلہ لوگوں کو جاننے کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی ان کے بارے میں پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں سوشل میڈیا کمپنیاں بڑی مہارت سے ہماری ٹریکنگ کرتی ہیں، مثلاً ہم نے کون کون سی پوسٹس لگائیں؟ کن پوسٹس کو لائیک کیا؟ کن لوگوں کو فالو کیا؟ کون کون سی وڈیوز دیکھیں؟ ہر وڈیو کو کتنی دیر اور کتنی بار دیکھا؟ سوشل میڈیا میں ہماری ساری حرکات وسکنات نہ صرف ریکارڈ ہوتی رہتی ہیں بلکہ ان کو مانیٹر بھی کیا جاتا ہے لہٰذا سوشل میڈیا کمپنیوں کو ہماری نقل وحرکت ہماری عادات واطوار ہماری پسند وناپسند، ہمارے مزاج اور ہماری کمزوریوں کی مکمل خبر ہوتی ہے۔ انہیں یہ بھی پتہ ہوتا ہے ہم کس وقت تنہا ہیں اور کس وقت اداس ہیں۔ غرض انہیں ہماری شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے پیش گوئی کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ وڈیو کے مطابق اس ڈیٹا تک رسائی کے لیے پہلا اقدام ہمیں Engage کرنا ہوتا ہے، اس کے لیے سوشل میڈیا کمپنیاں مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں۔ ان کمپنیوں میں کام کرنے والے ڈیزائنرز کسی بھی ماہرِ نفسیات کی طرح ذہنِ انسانی سے واقف ہوتے ہیں اور جانتے ہیں کہ انسانی ذہن کو کیسے تسخیر کیا جا سکتا ہے۔

سوشل میڈیا Engagement کے بعد اگلے مرحلے کی طرف لے جاتا ہے اور یہ مرحلہ Addiction کا ہے۔ آپ اپنے اردگرد اکثر ایسے لوگوں کو جانتے ہوں گے جو صبح جاگنے سے لے کر

رات سونے تک سوشل میڈیا کے ریشمی جال میں اپنی منشا اور رضا سے پھڑ پھڑا رہے ہوتے ہیں۔ سوشل میڈیا کمپنیاں انسانی نفسیات اور خود پسندی کے جذبے سے واقف ہیں اور اسی انسانی کمزوری پر اپنی عمارت کھڑی کرتی ہیں۔

سوشل میڈیا کے فیس بک یا ٹویٹر یا انسٹا گرام پر زیادہ ایکٹو رہنے والے لوگ ہر دم اپنی ذات کی منظوری دوسروں سے چاہتے ہیں۔ یہ نرگیست (Narcism) انہیں ہر دم بے چین رکھتی ہے۔ انہیں ہر لمحے یہ جستجو ہوتی ہے کہ ان کی پوسٹ پر کتنی Likes آئی ہیں، کتنے لوگوں نے انھیں ری ٹویٹ کیا ہے۔ یوں اپنی ذات کی اپروول (Approval) کا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس سفر میں ہم بزعمِ خود اپنے آپ کو ایک ایسے ہیرو کے روپ میں دیکھ رہے ہوتے ہیں' جس کی ہر بات، ہر ادا، اور ہر تجویز پر لوگ Likes' کمنٹس اور ری ٹویٹس کی صورت میں داد دیں۔ یہی وجہ ہے کہ محفل میں بیٹھے ہوئے بھی کچھ لوگ بار بار اپنے موبائل پر نظر رکھتے ہیں کہ اب Likes کی تعداد کتنی ہوگئی ہے۔ انسانی شخصیت میں تجسس اور خود پسندی کے انہی پہلوؤں کو سوشل میڈیا کمپنیاں ایکسپلائٹ کرتی ہیں' حتیٰ کہ سوشل میڈیا کا جنون ایک Addiction بن جاتا ہے۔ ایک ایسا نشہ جس کے استعمال کے بغیر ہمارے اعصاب اینٹھنے لگتے ہیں اور ہماری کیفیت ایسی ہو جاتی ہے جس طرح کسی مچھلی کو پانی سے نکال کر ریت پر پھینک دیا جائے۔ یوں سوشل میڈیا کمپنیاں Engagement کے مرحلے کے بعد ہمیں Addict بنانے کا مرحلہ بخوبی طے کر لیتی ہیں۔

ان دو مرحلوں کا اصل مقصد یہ جاننا ہوتا ہے کہ ہم لوگ کون ہیں اور ہماری پسند اور ناپسند کیا ہے؟ اب سوشل میڈیا کمپنیاں تیسرے مرحلے کی طرف بڑھتی ہیں جس کا مقصد ہمارے رویوں میں وہ تبدیلی لانا ہے اور جس کے پیسے ان کمپنیوں نے اپنیایڈورٹائزرز سے وصول کیے تھے۔ یہ کام انتہائی مہارت سے کیا جاتا ہے۔ ہماری شخصیت کے بارے میں سب کچھ جان لینے کے بعد غیر محسوس طریقے سے ویڈیوز اور اشتہارات کے ذریعے ہماری پسند و ناپسند میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ اس میں اہم نکتہ یہ ہے کہ بظاہر ہم اپنی مرضی سے چیزوں کا انتخاب کر رہے ہوتے ہیں

لیکن دراصل یہ سوشل میڈیا کا اپنا پھیلایا ہوا وہ ریشمی جال ہوتا ہے جس میں ہم اپنی رضا اور رغبت سے گرفتار ہو جاتے ہیں اور سوشل میڈیا کے پہلے سے طے کردہ سکرپٹ پر عمل شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے رویے کی یہی تبدیلی وہ پروڈکٹ ہے جسے سوشل میڈیا کمپنیاں ایڈورٹائزرز کو بیچتی ہیں۔ یوں اس ماڈل کے تین کونے ہیں ایک کونے پر ایڈورٹائزرز ہیں جن کا کاروبار سوشل میڈیا میں اشتہاروں کی وجہ سے ترقی کرتا اور یوں ان کے منافع میں اضافہ ہوتا ہے۔

دوسری طرف سوشل میڈیا کمپنیاں ہیں جو ایڈورٹائزرز سے اپنی خدمات کی خطیر رقم وصول کرتی ہیں، اور تیسرے کونے پر وہ لوگ ہیں جو سوشل میڈیا کا استعمال کرتے ہیں اور جن کے رویے میں تبدیلی کر کے سوشل میڈیا کمپنیاں اسے ایک پراڈکٹ کے طور پر بیچتی ہیں۔ دیکھا جائے تو ایڈورٹائزرز اور سوشل میڈیا کمپنیاں تو خوب پیسے کما رہی ہیں اور سوشل میڈیا استعمال کرنے والے لوگ جن کو بطور پروڈکٹ بیچا جا رہا ہے ان کو کچھ نہیں ملتا۔ اس کے برعکس ان کی زندگیوں پر سوشل میڈیا کے انتہائی مضر اثرات مرتّب ہوتے ہیں۔ ہمارے سماجی رشتوں پر اس کا انتہائی منفی اثر پڑا ہے۔ جسمانی اور نفسیاتی امراض میں اضافہ ہوا ہے، اور بڑی سطح پر فیس بک اور ٹویٹر کے منظم استعمال سے بعض ملکوں میں سیاسی عدم استحکام آیا ہے۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ پر لیکن سوشل میڈیا کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ یہ ایک ایسی طلسماتی پگڈنڈی ہے جس پر ہم ایک معمول کی مانند چلتے جا رہے ہیں، کوئی جادو کا محل ہے جس کی چکا چوند میں ہم اپنے گھر کا رستہ بھول گئے ہیں یا کوئی ریشمی جال ہے جس میں ہم اپنی اسیری سے بے خبر اس کے لمس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

اصلاحِ معاشرہ

خود احتسابی کا مناسب وقت

مفتی محمد اویس ارشاد

[مفتی محمد اویس ارشاد صاحب جامعہ دارالعلوم عیدگاہ کبیر والا کے استاذ اور ابھرتے ہوئے نوجوان قلم کار ہیں، آپ کی تحریریں النخیل کی زینت بنتی رہیں گی۔ ادارہ]

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ شعوری یا لاشعوری طور پر، انسان کی گذشتہ زندگی کا منظر اُس کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔ اِس تصور سے سبق حاصل کر کے اچھی چیزوں میں مزید بہتری کا عزم کرنا، ناگوار اعمال پر شرمندہ ہوکر، آئندہ نہ کرنے کا وعدہ، ناگوار عمل کو بہتر سے تبدیل کرنے کی کوشش کرنا سمجھداری ہے۔ یہ کام اگر فی الفور کرلیا جائے تو زندگی کو مزید ضائع کرنے سے بچا جاسکتا ہے، جبکہ یہ اہم کام لٹکاتے رہنا حسرت وافسوس کا سبب بن جاتا ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں: مومن اپنی گفتگو، کھانے، پینے کا (حلال وحرم ہونے کی حیثیت سے) تنقیدی تجزیہ کرتا رہتا ہے، جب کہ بے وقوف شخص اپنا جائزہ لیے بغیر زندگی میں بھاگتا چلا جاتا ہے۔ اپنا تنقیدی جائزہ لینا، اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے نفس کی قرآن مجید میں قسم کھائی ہے۔

اپنی گذشتہ زندگی کا جائزہ لینا "خود احتسابی" ہے۔ خود احتسابی کرتے ہوئے انسان اپنے ساتھ رعایت نہ رکھے، کیونکہ اپنا سخت محاسبہ کرنا کامیابی کا ضامن ہے۔ خود احتسابی کا مناسب وقت اور طریقہ، مستقبل نہیں، زمانۂ حال میں اپنے اختیار سے کرنا ہے۔ کیونکہ مستقبل میں خود احتسابی ضرور کرنی ہی ہے، اختیاری نہ سہی، بامر مجبوری، زندگی میں نہیں تو موت کے وقت اور اُس کے بعد ہمیشہ۔

موت کے وقت انسان بامر مجبوری، محاسبہ کرتا ہے، بلکہ کرایا جاتا ہے۔ تب وہ بہت سی غلطیوں کو سدھارنے کے لیے مہلت طلب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَأَنْفِقُوا مِنْ مَا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ [المنافقون:۱۰]

ترجمہ: اور ہم نے تمھیں جو رزق دیا ہے، اس میں سے (اللہ کے حکم کے مطابق) خرچ کرلو، قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کے پاس موت آجائے تو وہ یہ کہے کہ: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی دیر کے لیے اور مہلت کیوں نہ دے دی کہ میں خوب صدقہ کرتا، اور نیک لوگوں میں شامل ہوجاتا۔

موت کے وقت احتساب فرعون جیسا احتساب ہے، جس نے مرتے وقت، اللہ پر ایمان لانے اور مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ موت کا فرشتہ نظر آنے تک بہت دیر ہوچکی ہوتی ہے، تب خود احتسابی کا وقت نہیں ہوتا، اِس لیے احتساب عبث اور بیکار جاتا ہے۔

جسم سے روح نکلنے کے بعد کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی شروع ہوتی ہے۔ جو انسان اپنی زندگی میں خود احتسابی کرکے خود میں مثبت تبدیلی نہ لاسکے، اُس کی بعد کی زندگی کا ہر لمحہ بے فائدہ خود احتسابی میں گذرے گا۔ روزِ محشر اسے باور کرایا جائے گا:

اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا [الاسراء:۱۴]

ترجمہ: اپنا نامہ عمل خود پڑھ لو، آج اپنے حساب کے لیے تم خود ہی کافی ہو۔

یہ نامہ عمل مایوسی اور اندھیروں کو مجموعہ ہوگا، اپنا کیا دھرا، ہاتھ میں آنے کے بعد کف افسوس ملتا ہوا کہے گا: کاش! میرے احتساب کا رجسٹر مجھے نہ دیا گیا ہوتا، کاش! میں نے اِس میں کچھ اچھے اعمال میں درج کرائے ہوتے، کاش! میں غلط لوگوں کی دوستی میں نہ پڑا ہوتا۔

تب، انسان کو اپنا محاسبہ کرنے سے ذرہ فائدہ نہیں ہوگا۔ مگر، اب اگر تصور میں اپنے کو موت، محشر یا اُس کے بعد کے مراحل پر کھڑا کر کے محاسبہ کرے تو بہت مفید ہے۔ ہر شخص خود کو موت کے سامنے کھڑا کر کے سوچے، کیا وہ پُرسکون، مطمئن ہو کر موت کے لیے تیار ہے یا بہت سی غلطیوں کی تلافی

کا خواہش مند؟ اگر فرشتۂ اجل نظر آنے کے بعد اسے محاسبہ کر کے اُس کی تلافی کے لیے کچھ وقت دیا گیا تو اُس مختصر ترین وقت میں، کیا کرے گا؟ جن امور کا تصور ذہن میں آتا ہے، ظاہر ہے، یہ سب کام تب نہیں ہو سکیں گے، مہلت ملے گی ہی نہیں، مگر اب ہو سکتے ہیں، اب مُہلت ملی ہوئی ہے۔ اِس لیے یہ سب تلافیاں اب کر لے۔

خود کو قبر میں رکھ کر دیکھے۔ کن امور پر حسرت وافسوس کر کے، تلافی کا خواستگار ہو گا؟ حشر اور بعد کے مراحل میں خود کو کھڑا کر کے، سوچے! کیا موجودہ حالت، مطمئن کھڑا کرنے کے لیے کافی ہے؟ اُس وقت تلافی مافات کا موقع دیا گیا تو کس طرح تلافی کرے گا؟ وہ کام تب نہیں ہو سکیں گے، اب ہو سکتے ہیں۔

معلوم ہوا خود احتسابی کا مناسب وقت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد محاسبہ کرنا کارگر نہیں ہو گا، مگر اب انتہائی سود مند ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تمہارا حساب کیے جانے سے پہلے، خود اپنا حساب کرلو، کیونکہ اپنا حساب خود کرنا، دوسروں کے حساب کرنے سے آسان ہے۔ (کیونکہ اس میں انسان تلافی کر سکتا ہے، دوسرے حساب کریں گے تو سزا ہو گی، تلافی نہیں ہو گی۔)

ابراہیم تیمی کہتے ہیں: میں نے تصور کیا کہ میں جنت میں ہوں، نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ پھر تصور کیا کہ میں جہنم میں ہوں، زنجیروں میں جکڑا ہوا، زقوم کھا رہا ہوں، جہنمیوں کی پیپ پینے پر مجبور ہوں، جہنم میں خود سے پوچھ رہا ہوں: کیا چاہتے ہو؟ کہا: دُنیا میں واپس جا کر غلطیوں کی تلافی کر کے، نیک اعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اِس پر میں نے خود سے کہا: یہ لو! تم دُنیا میں موجود ہو، برائیوں سے بچ کر، ابھی نیکیاں کرلو۔ تب واپس نہیں آنے دیا جائے گا۔

حسن بصری فرماتے ہیں: جو لوگ دُنیا میں خود احتسابی کرتے رہتے ہیں، قیامت کے دن ہلکے حساب میں رہیں گے، جنہوں نے زندگی خود احتسابی کیے بغیر، بسر کر دی، وہ قیامت کے روز سخت محاسبہ کا شکار ہو سکتے ہیں۔

☆......☆......☆

میرا مطالعہ

مفتی نیک محمد جودھپوری

[مفتی نیک محمد جودھپوری صاحب استاذ ادارہ مرکز المعارف، پیپاڑ سیٹی، جودھپور، راجھستان، (بھارت) کا یہ مضمون جو النخیل کی خصوصی اشاعت "مطالعہ نمبر" کے لیے تحریر کیا گیا بوجوہ شاملِ اشاعت نہ ہوسکا، افادۂ عام کے لیے نذرِ قارئین ہے۔ ادارہ]

ماہِ صفر کی بارہویں شب کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے۔ عشاء بعد اپنے دن بھر کے اسباق کا تکرار کررہے مدرسے کے طلبہ کی نگرانی کر کے واپس اپنے کمرے آیا ہی تھا کہ فون کی اسکرین پر ایک غیر ملکی نمبر سے پیغام موصول ہوا۔ بالاستیعاب پڑھنے پر معلوم ہوا کہ حضرت مولانا ابن الحسن عباسی دامت برکاتہم کی زیرِ ادارت ایک ماہ نامہ "النخیل" نکلتا ہے۔ مجھ سے اس کے عن قریب شائع ہونے والے مطالعہ نمبر کے لیے اپنا اثر نامہ تحریر کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ میرے لیے یہ نہایت خوش کن حیرت تھی کہ اتنے بڑے اور عالمی پیمانے کے پرچے کے مخصوص نمبر میں مجھ سے کوئی کیوں لکھوا رہا ہے؟ سوال نامہ دیکھا، جو کافی رنگارنگ اور تنوع پر مبنی تھا۔ واقعی یہ ایک نہایت حسین، دل چسپ اور قابلِ قدر کوشش ہے، جس پر النخیل کی ادارتی جماعت مبارک باد کی مستحق ہے۔ الغرض میں نے اس وقت تو جواب کے لیے ہاں کر دی، مگر پھر جب اپنے مختصر سے عرصۂ حیات میں پیچھے مڑ کر دیکھا تو اِس سرے سے اُس سرے تک ایک ایسا عجیب اور حیرت انگیز جہاں دکھائی دیا، جو اگر ایک طرف مسرت آمیز تھا تو دوسری طرف فکر انگیز بھی۔

الغرض سوال نامے میں سب سے پہلا سوال ذوقِ مطالعہ کے آغاز اور اس کے ابتدائی عوامل کے

بارے میں ہے۔ یادش بہ خیر میرے اندر ذوقِ مطالعہ میرے اپنے گاؤں کے مکتب کے زمانے ہی سے کسی نا کسی درجے میں پیدا ہو گیا تھا۔ گو کہ میرے پاس پڑھنے کو میری اپنی اردو زبان کی پہلی دوسری کتاب کے ساتھ مسجد میں نمازیوں کی یومیہ تعلیم کے لیے رکھی ہوئی "فضائل اعمال" اور اُس ترجمہ قرآن کریم کے علاوہ کچھ نہ تھا، جو بوسیدہ سی شکل میں ایک عرصے سے مسجد کے ایک طاق میں رکھا تھا اور جس کے حاشیے پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے نہایت دل چسپ فوائد لکھے تھے۔

عمر یہی کوئی دس گیارہ سال رہی ہوگی۔ جس دن کتاب کا پہلا سبق دیا گیا، میرے ذوق نے ساتھ دیا اور میں نے تقریباً آدھی یا اس سے بھی زائد کتاب پڑھ ڈالی۔ پھر جوں جوں آگے بڑھا، جہاں کہیں کچھ لکھا پایا، پڑھا۔ خواہ کچھ سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو۔ اردو تو اردو، ہندی، انگریزی تک کو شروع ہی سے غلط صحیح کسی بھی طرح پڑھنے کی کوشش ضرور کی۔ چاہے اسے مطالعے کا ابتدائی نقش کہنا زیادتی ہوگا کہ مطالعے کے لئے لامحالہ کسی کتاب کا ہونا لازم ہے؛ مگر ایک بچے کے گھر کا ماحول اور پورے گاؤں کا دینی و علمی ماحول اگر ایسا ہو کہ وہاں سوائے مسجد کے منبر اور امام کے کمرے کے، کسی جگہ اردو کی کسی کتاب کا ملنا تقریباً ناممکن تھا، تو وہ اس جذبے کی تسکین کچھ اسی انداز میں کرے گا۔

☆...... جہاں تک خاندانی نظامِ تربیت کے اثر کی بات ہے تو چوں کہ والدین اور بہن بھائیوں میں سے کوئی پڑھا لکھا نہ تھا، اس لیے پڑھنے کے سلسلے میں کسی طرح کی رہنمائی تو خیر ملنے سے رہی۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ میں اپنے گھر میں جب بھی پڑھنے لکھنے کے لیے بیٹھا، گھر کے سبھی افراد نے میرا مکمل تعاون کیا۔ مجھ سے کام کاج نہ کروا کر خود کر لیا اور مجھے پڑھنے لکھنے کے لیے فارغ رکھا اور سب نے میری راحت کا ہر طرح خیال رکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک نوخیز طالب علم کی زندگی میں اس کا بھی بڑا دخل ہے۔

☆...... جہاں تک ان شخصیتوں کا سوال ہے، جنھوں نے میرے ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کرنے کا کام کیا، تو وہ سب سے پہلے میرے ناظرہ قرآن کریم اور اردو زبان کے استاذ حافظ محمد اسماعیل صاحب دام ظلہ تھے۔ انھوں نے بہت بر وقت مجھے پرکھا اور پھر صرف میرے لیے اپنے مکتب کا نظام اس طرح بنایا کہ میں زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکوں۔ جب مکتب سے بڑے ادارے میں آیا تو

میرے جملہ اساتذہ بہ طورخاص مفتی ممتاز احمد صاحب قاسمی و مولانا نصیرالدین صاحب قاسمی نے مجھے مطالعے کی اہمیت سمجھائی۔ میرے سامنے وہ مطالعہ کرتے رہے، جس سے میں خوب متاثر ہوا۔ مطالعے کے لیے اپنی ذاتی کتب مرحمت فرمائیں اور ہمیشہ اس راہ کی مشکلات سے نمٹنے کے لئے رہ نما اصول بتائے۔ عمدہ کتب اور مصنّفین کی جانب رہ نمائی بھی کی۔ میری زندگی میں ان حضرات اساتذۂ کرام کا بڑا کردار ہے۔

☆......رہی بات مطالعے کے مختلف ادوار اور اس ذوق کے ارتقاء کی، تو ابتدائی دنوں میں قدرتی طور پر میں بھی عام بچوں کی طرح ہلکے پھلکے قصے کہانیاں اور ہلکی بحر کی سادہ زبان میں لکھی نظمیں پڑھنے کا عادی تھا۔ عبارت میں جہاں ایک دو لفظ ایسے آئے، جن کے معنیٰ مجھے معلوم نہ ہوتے، تو سارا مزہ خراب ہو جاتا۔ پھر ایک دور دل چسپ اور قاری کو باندھ کے رکھنے والی تحریروں کا آیا۔ یہ خواہ کسی کی سوانح ہوں، سفرنامے ہوں، انشائیے ہوں یا کسی اور نوعیت کی تحریریں۔ میری دل چسپی کا سامان کئی بار تحریر کے مواد سے زیادہ صاحبِ تحریر کے اسلوبِ نگارش میں ہوتا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے انوکھے اور نرالے انداز سے اسی دور میں شناسائی ہوئی۔ کئی بار ان کی نقل بھی کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان دنوں میں اقبال مرحومؒ، مولانا علی میاںؒ وغیرہ میرے دل چسپ قلم کار تھے اور آج بھی ہیں۔ ان پر لکھی کوئی بھی تحریر میں پڑھ ہی لیتا تھا۔ اسی طرح ایک دور وہ بھی آیا، جب ایسی تحریریں تلاش کر کر کے پڑھنے لگا، جو معلوماتِ عامہ سے بھرپور ہوں۔ عام مولویانہ طرزِ تحریر سے ہٹ کر لکھی گئی اردو کتابیں بھی پسند آئیں۔ اب یہ حالت ہے کہ جس کی ضرورت ہوتی ہے، پڑھتے ہیں۔ کسی خاص جہت میں مقید نہیں ہیں۔

☆......**پسندیدہ موضوع:** سفرنامے، سوانح اور دل چسپ انشائیے ہیں۔

☆......پسندیدہ مصنف جو چل بسے، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، زندوں میں مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور مولانا نور عالم خلیل الامینی (۱) ہیں۔

☆......**میری پسندیدہ کتابیں:** عربی میں **ماذا خسر العالم**، اردو میں مولانا دریابادیؒ کی آپ

---

(۱) آپ کا انتقال ۰۳ مئی ۲۰۲۱ء کو ہوا۔

بیتی اور سفر نامہ حجاز، مفتی تقی عثمانی کے سبھی سفر نامے، اقبالؒ کی کلیات اور مولانا نور عالم خلیل الامینی کی پس مرگ زندہ۔

☆...... **میرے پسندیدہ رسائل:** عربی میں دار العلوم دیوبند سے نکلنے والا ماہ نامہ: **الداعی** ہے۔ اور اردو میں فقہی سہ ماہی بحث ونظر، حیدر آباد اور تحقیقات اسلامی، علی گڑھ۔

☆...... **پسندیدہ افسانہ نگار:** منشی پریم چند، راجندر سنگھ بیدی اور شوکت تھانوی۔

☆...... **پسندیدہ کالم نگار:** ابن انشا، رضا علی عابدی اور اوریا مقبول جان۔

☆...... **پسندیدہ مزاح نویس:** ابن انشا، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، قدرت اللہ شہاب اور مشتاق احمد یوسفی۔ یہ سب طنز نگار بھی بلا کے ہیں۔

☆......مطالعے کا وقت خواہ کوئی بھی ہو، میں کسی بھی وقت کتب بینی کر سکتا ہوں۔ بس مجھے کوئی ذہنی مشغولیت نہ ہو اور پاس میں کسی قسم کا غیر علمی شور و شغب نہ ہو۔

☆......مطالعے کی رفتار موضوع اور مضمون کو دیکھ کر مختلف ہوتی ہے۔ ہلکے پھلکے اور جلد سمجھے جا سکنے والے مضمون فی گھنٹہ چالیس سے پچاس صفحے پڑھ لیتا ہوں۔ تحقیقی چیزیں کم پڑھی جاتی ہیں۔

☆......دوران سفر گہرائی سے مطالعہ ممکن نہیں ہوتا۔ ہلکی پھلکی چیزیں کبھی پڑھ لیتا ہوں۔ کبھی رکھ دیتا ہوں۔ اکثر فطرت کا ہی مطالعہ کرتا ہوں۔

☆......اگر چہ میں خود ابھی نئے لکھنے والوں ہی کی فہرست میں ہوں، مگر پھر بھی کسی قدر تجربہ ان سے ساجھا کروں گا۔ اگر آپ محض تفریحِ طبع اور افزائشِ معلومات کے لیے مطالعہ کرتے ہیں تو جو تعمیری تحریر بھی سامنے آئے، اس کو ایک طرفہ پڑھ ڈالیں لیکن اگر تحقیقی اور کسی جہت کو سامنے رکھ کر مطالعہ کر رہے ہیں تو کوشش کریں کہ آپ کے نقطۂ نگاہ سے مخالفت و موافقت رکھنے والی اس موضوع کی تمام کتابیں یک بارگی سرسری ہی سہی، ضرور دیکھ لیں تا کہ موضوع ہر طرح سے کھل کر سامنے آ جائے اور اس کا کوئی گوشہ آنکھوں سے اوجھل نہ رہے۔

☆......کتابوں کے انتخاب سے بھی اہم مصنف کا انتخاب ہے۔ ابتدا میں چوں کہ قاری کی طبیعت خود غیر شعوری طور پر لکھاری کا اثر قبول کرتی ہے اور اس کا اسلوبِ نگارش اخذ کرتی ہے، اس

لیے لازمی طور پر ایسے ماہرِ فن قلم کاروں کو پڑھا جائے، جن کی زبان ستھری اور شستہ ہو۔ تحریر میں ادب اور برجستگی کا رنگ ہو۔ جو سادہ، صاف اور سہل نگار ہوں۔ اگر تفریحی اور عام معلوماتی نوعیت کی کتابیں ہوں تو ان کے انتخاب میں کسی ماہرِ فن کو ضروری نہیں سمجھتا مگر علمی اور فنی بحث و تحقیق ہو یا کوئی اہم منصوبہ بند پروجیکٹ پر کام ہو تو ضرور کسی رہ نما کے زیرِ سایہ کام کی انجام دہی ہو۔

تعلیم وتربیت

موت کی مشین اور سکون کی تلاش

محمد بشارت نواز

"انسانیت اپنی زندگی سے اس قدر تنگ ہوجائے گی کہ وہ موت کے آسان طریقے تلاش کرنے لگے گی، حالاں کہ ان کے پاس عیش وآرام کے وافر اسباب موجود ہوں گے" شاید ماضی کے انسان نے یہ سوچا بھی نہیں ہوگا۔ بظاہر یہ ایک نا قابلِ یقین بات ہے لیکن اس کا وقوع بھی اس دنیا میں ہوچکا ہے۔ چند دن سے عالمی میڈیا پر ایک خبر کا چرچا ہے کہ:

> "آسٹریلوی ڈاکٹر، مصنف اور ایگزٹ انٹرنیشنل جیسے سماجی ادارے کے بانی ڈاکٹر فلپ نے چند ماہ قبل ایک مشین تیار کی، جسے یورپی ملک "سوئٹزرلینڈ" کی حکومت نے اس کے عام استعمال کی اجازت دے دی ہے، جس سے لوگ آسانی سے بغیر تکلیف کے خودکشی کرسکیں گے۔ ڈاکٹر فلپ نے اس مشین کو "سارکو" کا نام دیا ہے جو کہ لوگوں کو بغیر درد کے مرنے میں مدد دے گی۔"

مغربی ممالک میں خودکشی کی شرح تو پہلے ہی سب سے زیادہ رہی ہے، یہاں تک کہ اجتماعی خودکشی کا رواج بھی عام ہے، حالاں کہ ان ممالک کو دنیا کے ترقی یافتہ ممالک اور یہاں کے رہنے والوں کو دنیا کے خوشحال ترین لوگ شمار کیا جاتا ہے، اب خودکشی کی اس مشین کے عام استعمال کی سب سے پہلے اجازت دینے والا ملک "سوئٹزرلینڈ" جس کا شمار دنیا کے مالدار، خوبصورت اور محفوظ سمجھے جانے والے ممالک میں ہوتا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ ایک طرف کوہ الپس کی خوبصورت وادیوں اور

دوسری طرف ایورہ کی اونچی نیچی پہاڑیوں میں واقع ہے، زیادہ تر علاقہ الپس کے خوشنما وخوش منظر پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے، جس کا نظارہ کرنے کے لیے دنیا بھر کے لاکھوں سیاح ہر سال وہاں آتے ہیں، مجموعی ملکی پیداوار کے لحاظ سے سوئٹزرلینڈ دنیا کے امیر ترین ممالک میں شامل ہے۔اس کے محفوظ بینک کاری نظام کے باعث دنیا کے امیر ترین لوگوں نے اپنے مال وزر وہاں کے بینکوں میں جمع کرا رکھے ہیں، وہاں جنسی خواہشات پوری کرنے کے لیے زنا عام ہے، زنا کاری اور ہم جنس پرستی کو قانونی تحفظ حاصل ہے یعنی باہمی رضامندی سے جب چاہیں جس سے چاہیں زنا کر سکتے ہیں، ان تمام اسباب ووسائل کے باوجود سکون سے محروم وہاں کے باشندے اب سکون کی تلاش میں موت کو گلے لگانے میں پہل کر رہے ہیں، اس سے بڑی واضح اور کھلی دلیل اور کیا ہوگی کہ حقیقی سکون اس پرتعیش زندگی میں تو نہیں ہے۔

یہاں یہ فرق کرنا ضروری ہے کہ انسان اپنی فہم کے مطابق جن چیزوں میں سکون سمجھتا ہے، وہ اسبابِ راحت ہیں جب کہ سکون جو "اطمینانِ قلب" کا نام ہے، وہ اس سے الگ ہے۔انسان سکون کے حصول کے لیے اسبابِ راحت تو جمع کر لیتا ہے مگر اطمینانِ قلب نصیب نہ ہونے کی وجہ سے دل کی بے چینی و بے قراری برقرار رہتی ہے، جسے کبھی میوزک سن کر، کبھی رقص کر کے، کبھی شراب پی کر، کبھی سیر وسیاحت کے ذریعے اور کبھی انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے خودکشی کر کے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر خودکشی کے آسان طریقے تلاش کرتا ہے لیکن جس گلستاں کے اجڑنے سے یہ بہار روٹھی ہے، اسکی طرف دھیان ہی نہیں جاتا:

دل گلستاں تھا تو ہر شے سے ٹپکتی تھی بہار
دل بیاباں ہوگیا عالم بیاباں ہوگیا

آخرت کا انکار کرنے والا یا آخرت کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا انسان اس طرح کا قدم اٹھائے تو شاید بعید از عقل نہ ہو، آخرت پر یقین رکھنے والوں کا بھی ان ہی چیزوں کو اطمینانِ قلب و فرحتِ باطنی کا ذریعہ سمجھنا تو کھلی نادانی ہے، اطمینانِ قلب کے حصول کے سلسلے میں انسان کو پیدا

کرنے والے کا اعلان ملاحظہ کیجیے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ (سورہ الرعد:۲۸)

ترجمہ: جان لو! اللہ کے ذکر سے دل چین پاتے ہیں

"ذکر اللہ" اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے نماز، تلاوتِ قرآن اور دعا و استغفار وغیرہ سب ہی کو شامل ہے اور یہ سب اس کی خاص خاص شکلیں ہیں لیکن مخصوص عرف و اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس، توحید و تمجید، اس کی عظمت و کبریائی اور اس کی صفات کمال بیان اور دھیان کو ذکر اللہ کہا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت و فضل اور اس کے احسان و کرم کو یاد کر کے بے قرار دلوں کو قرار اور اطمینان حاصل ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد محبتِ الٰہی، قربِ الٰہی اور اطمینانِ قلب کا عظیم ذریعہ ہے اور یہ دلوں کے قرار کا سبب ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو یقیناً درست ہوگا کہ ذکرِ الٰہی کی طبعی تاثیر ہی دلوں کا قرار ہے، اسی لیے پریشان حال آدمی جب پریشانی میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اس کے دل کو قرار آنا شروع ہو جاتا ہے، ایسے ہی قرآن بھی اللہ کا ذکر ہے اور اس کے دلائل دلوں سے شکوک و شبہات دور کر کے چین دیتے ہیں، اسی طرح دعا بھی اللہ کا ذکر ہے اور اس سے بھی حاجت مندوں کو سکون ملتا ہے اور اسمائے الٰہی اور عظمتِ الٰہی کا تذکرہ بھی اللہ کا ذکر ہے اور اس سے بھی ایمان والوں کے دلوں کو چین ملتا ہے یعنی حقیقت میں یہ اعمالِ صالحہ ہی ہیں جن سے حقیقی سکون اور ابدی اطمینان نصیب ہوتا ہے، ان اعمالِ صالحہ میں جس قدر اضافہ ہوگا، اسی قدر اطمینانِ قلب بڑھتا رہے گا، اسی کے متعلق حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

> "اگر دنیا کے بادشاہوں کو ہماری عافیت اور سکون اور راحت کا پتہ چل جائے تو وہ بادشاہ تلواریں لے کر ہمارا مقابلہ کرنے کے لیے آجائیں کہ یہ راحت اور سکون ہمیں دے دو۔

اسی طرح یہ سکون مخلوق سے نگاہیں ہٹانے اور مخلوق سے توقعات ختم کرنے سے حاصل ہوتا ہے...... جب مخلوق سے توقعات ختم ہو جاتی ہیں تو پھر حقیقی سکون حاصل ہو جاتا ہے۔

☆......☆......☆

نقد ونظر

”طرزِ تحقیق“ یا ”نوطرزِ تحقیق“

ڈاکٹر محمود احمد کاوش

ڈاکٹر محمود احمد کاوش (پرنسپل قائدِ اعظم اکیڈمی فار ایجوکیشنل ڈیویلپمنٹ، نارووال) ایک استاد، محقق اور نقاد ہیں، آپ ”اردو اور اس کی تدریس“، ”اردو کی مختصر آپ بیتیاں“ (حواشی اور اضافہ)، ”قافلے اجالوں کے“ (شخصی خاکے)، ”مشفق خواجہ: احوال و آثار“، ”نگارشاتِ مشفق خواجہ“، ”سلسلہ مکاتیب“ سمیت کئی کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔ آپ کی تحریریں النخیل کی زینت بنتی رہیں گی، ان شاء اللہ۔ ادارہ]

ہمارے بہت سے کرم فرما اپنی تصنیفات و تالیفات ہمیں بھیجتے رہتے ہیں۔ کئی خواتین و حضرات دُوسروں کی کتابیں بھیجنے کا فریضہ بھی انجام دیتے رہتے ہیں۔ اکثر کتابوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ”مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا“۔ موصول ہونے والی کتابوں میں بیش تر مجموعہ ہائے کلام ہوتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ شاعروں کے معاملے میں ہم خود کفالت کی منزل سے گزر کر اُنھیں برآمد کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ تنقید یا تحقیق کی کتابوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔ ایسے میں کوئی تنقیدی یا تحقیقی کتاب ملے تو خوشی ہوتی ہے۔ حال ہی میں ایک شاگرد کی وساطت سے ”طرزِ تحقیق“ نامی کتاب ملی۔ یہ کتاب اگست ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ پڑھا تو افسوس ہوا کہ آخر پانچ سال تک یہ کتاب ہم تک کیوں نہ پہنچی اور ہم اس کے مطالعے سے کیوں محروم رہے۔ اگر فاضل مصنف اپنی کتاب کا نام ”طرزِ تحقیق“ کے بجائے ”نوطرزِ تحقیق“ رکھتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔

ہمیں اگرچہ زیادہ پڑھے لکھے ہونے کا دعویٰ نہیں، تاہم تحقیق کے موضوع پر جو دو چار کتابیں

ہماری نظر سے گزری ہیں، اُن میں عبدالرزاق قریشی کی ”مبادیاتِ تحقیق“، پروفیسر عبدالستار دلوی کی ”ادبی اور لسانی تحقیق“ (اصول اور طریقِ کار)، رشید حسن خاں کی ”تدوین۔ تحقیق روایت“ اور ”ادبی تحقیق ۔۔۔ مسائل اور تجزیہ“ ڈاکٹر نذیر احمد کی ”تصحیح و تحقیقِ متن“، ڈاکٹر سلطانہ بخش کی ”اُردو میں اُصولِ تحقیق“، ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی ”اُصولِ تحقیق و ترتیبِ متن“، ڈاکٹر گیان چند جین کی ”تحقیق کا فن“، ڈاکٹر عطش درانی کی ”اُردو تحقیق“، ڈاکٹر غلام مصطفی کی ”تنقید و تحقیق“، ڈاکٹر معین الدین عقیل کی ”پاکستان میں اُردو تحقیق۔ موضوعات اور معیار“ اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی ”ادبی تحقیق“ شامل ہیں۔

بھلے وقتوں میں عالم فاضل لوگ تحقیق کے کوچے میں قدم رکھتے تھے اور اپنے علم اور تجربے سے پڑھنے والوں کے لیے استفادے کا سامان فراہم کیا کرتے تھے۔ ان علما نے تحقیق کے فن، اس کی مبادیات، ضرورت و اہمیت، صحتِ متن کی اہمیت، متن کی تدوین کے طریقِ کار، املا کی صحت وغیرہ کے متعلق اپنے گراں قدر خیالات پیش کیے ہیں لیکن اب تو ”ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی“ والا معاملہ ہے۔

اِس کتاب کے ”پیش لفظ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے مشمولات دراصل فاضل مصنف کے ایم۔فل کے زمانۂ طالب علمی کی وہ تحریریں ہیں جو اسائنمنٹ کے طور پر پیش کی گئی تھیں۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی کا اصرار تھا کہ انھیں کتابی صورت میں سامنے لایا جائے، اس کے باوجود صاحبِ تحریر کش مکش میں مبتلا رہے کہ یہ مضامین اِس قابل بھی ہیں کہ نہیں۔ پھر جب وہ خود ایم۔فل کے طالب علموں کو مختلف موضوعات پڑھانے پر مامور ہوئے تو اُنھیں احساس ہوا کہ یہ مضامین ان طالب علموں کے لیے بہت مفید ہوں گے۔ فاضل مصنف کے بقول اِن مضامین میں گہرے فکر و فلسفہ کی بجائے براہِ راست عملی سطح پر کام کرنے پر توجہ دی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے مزید لکھا ہے کہ اُنھوں نے تدریس میں ہمیشہ یہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے کہ طالب علم کو عملی کام کی تربیت دی جائے۔ آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ اِس کتاب کی مدد سے طالب علم کو کس طرح عملی کام کی تربیت دی جا سکتی ہے۔

دُوسرے باب کے آغاز میں فاضل مصنف نے لفظِ تحقیق سے بحث کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ

بابِ تفعیل کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں تکلف پایا جاتا ہے۔ اس "تکلف" کی مزید وضاحت نہیں ملتی۔ ہم نے اِس لفظ پر غور کیا تو یہ راز کھلا کہ چوں کہ مصنف نے اِس کتاب میں تحقیق کی ہے اور ظاہر ہے تکلف کر کے کی ہے، اِس لیے تحقیق کی بنیادی خصوصیت تکلف قرار دے رہے ہیں۔ ویسے اُنھیں اِس تکلف کی ضرورت نہیں تھی کہ میرے جیسے بہت سے قاری اِس کتاب کو پڑھنے کی تکلیف سے بچ جاتے۔

اِس کتاب کی ایک خاص بات ایسی ہے کہ کسی بھی زبان میں لکھی گئی کسی بھی کتاب سے اس کی مثال نہیں ڈھونڈی جا سکتی۔ ہم نے بہت بڑا دعویٰ کیا ہے۔ اِتنی بڑی دُنیا اور اِس میں کروڑوں کی تعداد میں کتابیں موجود ہیں، پھر اِس کتاب کی یکتائی اور بے مثل ہونے کا سبب کیا ہے۔ آپ بھی یہ سبب جانیں گے تو فوراً ہمارے ہم خیال ہو جائیں گے۔ تو صاحب آپ بھی سنیے! اِس کتاب کے کم از کم اٹھاون صفحات ایسے ہیں جو دُہرائے گئے ہیں۔ ہم تکلیف کر کے ایسے صفحات کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ ممکن ہے آپ کوشش کر کے اِس میں مزید اضافہ کر سکیں۔

صفحہ ۲۲ اور صفحہ ۲۰۹، صفحہ ۲۳ اور صفحہ ۲۱۰، صفحہ ۲۴ اور صفحہ ۲۱۱، صفحہ ۲۵ اور صفحہ ۲۱۲، صفحہ ۲۶ اور صفحہ ۲۱۳، صفحہ ۲۷ اور ۲۱۴، صفحہ ۲۸ اور صفحہ ۲۱۵، صفحہ ۲۹ اور صفحہ ۲۱۶، صفحہ ۳۰ اور صفحہ ۲۱۷، صفحہ ۳۱ اور ۲۱۸، صفحہ ۳۲ اور صفحہ ۲۱۹، صفحہ ۳۳ اور ۲۲۰، صفحہ ۳۴ اور صفحہ ۲۲۱، صفحہ ۳۵ اور صفحہ ۲۲۲، صفحہ ۳۶ اور صفحہ ۲۲۳، صفحہ ۳۷ اور صفحہ ۲۲۴، صفحہ ۳۸ اور ۲۲۵، صفحہ ۳۹ اور صفحہ ۲۲۶ ایک جیسے ہیں۔

اسی طرح صفحہ ۴۹ اور ۵۰ کو ہو بہو صفحہ ۱۶۳ پر، ۵۰ اور ۵۱ کو ۱۶۴ پر، ۵۱ اور ۵۲ کو ۱۶۵ پر، ۵۲، ۵۳ اور ۵۴ کو ۱۶۶ پر، ۵۴ اور ۵۵ کو ۱۶۷ پر، ۵۵ اور ۵۶ کو ۱۶۸ پر، ۵۶ کو ۱۶۹ پر، ۵۷ کو ۱۷۰ پر، ۵۸ اور ۵۹ کو ۱۷۱ پر، ۵۹ اور ۶۰ کو ۱۷۲ پر، ۶۱ کو ۱۷۴ پر، ۶۲ کو ۱۷۵ پر، ۶۳ کو ۱۷۶ پر، ۶۴ کو ۱۷۷ پر، ۶۵ کو ۱۷۸ پر، ۶۵ اور ۶۶ کو ۱۷۹ پر، ۶۶ کو ۱۸۰ پر، ۶۷ اور ۶۸ کو ۱۸۱ پر، ۶۸ اور ۶۹ کو ۱۸۲ پر، ۶۹ اور ۷۰ کو ۱۸۳ پر، ۷۰ اور ۷۱ کو ۱۸۴ پر، ۷۱ اور ۷۲ کو ۱۸۵ پر، ۷۲ اور ۷۳ کو ۱۸۶ پر، ۷۳ اور ۷۴ کو ۱۸۷ پر، ۷۴ اور ۷۵ کو ۱۸۸ پر، ۷۵ اور ۷۶ کو

۱۸۹ پر، ۶۷ اور ۷۷ کو ۱۹۰ پر، ۸۰ کو ۱۴۵ پر، ۸۱ کو ۱۴۶ پر، ۸۲ کو ۱۴۷ پر، ۸۳ کو ۱۴۸ پر، ۸۴ کو ۱۴۹ پر، ۸۵ کو ۱۵۰ پر، ۸۶ کو ۱۵۱ پر، ۸۷ کو ۱۵۲ پر، ۸۸ کو ۱۵۳ پر، ۸۹ کو ۱۵۴ پر، ۹۰ کو ۱۵۵ پر دُہرایا گیا ہے۔

بعض ابواب کے عنوانات میں بھی یک سانی پائی جاتی ہے۔مثال کے طور پر دُوسرا باب ”تحقیق کے تقاضے“ اور تیرھواں باب ”تحقیق کے تقاضے اور مطبوعہ تحقیقی کتاب کا تعارف“، ساتواں باب ”بنیادی اور ثانوی مآخذ“ اور بارھواں باب ”بنیادی اور ثانوی مآخذ۔تعریف اور اہمیت“ آٹھواں باب ”تحقیقی مقالے میں حوالہ درج کرنے کا طریقۂ کار“ اور چودھواں باب ”حوالہ جات اور اقتباسات کی بحث“ ایک جیسے مواد پر مشتمل ہیں۔

شخصیات کے حوالے سے کام میں آسانی کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے بعض شخصیات کے حوالے سے قابلِ قدر کام سامنے آنے کی بات کی ہے۔قاری یہ توقع کرتا ہے کہ شخصیات کے حوالے سے عمدہ کاموں کی مثالیں بھی دی جائیں گی مگر فاضل مصنف صرف مشتاق احمد یوسفی پر لکھے گئے ایم۔اے کی سطح کے ایک مقالے کا ذکر کر کے آگے نکل جاتے ہیں۔لگتا ہے کہ اب تک شخصیات پر جتنے مقالے لکھے گئے ہیں، اُن میں قابلِ تقلید یہی مقالہ ہے۔آگے چل کر فاضل مصنف نے اِس مقالے کی کم زوریوں کا بھی ذکر کیا ہے۔فاضل مصنف کی نظر اوری اینٹل کالج میں شخصیات پر کیے گئے مزید کاموں پر پڑتی تو وہ ڈپٹی نذیر احمد پر لکھے گئے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے مقالے کا ذکر کر سکتے تھے۔ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے اکبرالہ آبادی پر کیے گئے کام کا حوالہ دیا جا سکتا تھا۔ڈاکٹر تحسین فراقی کے عبدالماجد دریابادی پر لکھے گئے مقالے کا ذکر بھی کیا جا سکتا تھا۔

تحقیق کے بارے میں ہماری معلومات واجبی سی ہیں، بلکہ شاید واجبی بھی نہیں ہیں۔اِس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ حواشی میں جن مصادر یا منابع کا ذکر نہ ہو، اُنھیں بھی کتابیات میں شامل کیا جا سکتا ہے۔مثال کے طور پر پہلے باب کی کتابیات میں ڈاکٹر حسن اختر ملک کی ”تہذیب و تحقیق“، رشید حسن خان کی ”ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ“، علامہ محمد جعفر الکتانی کی ”الرسالہ المستطرفۃ“ کے نام ملتے ہیں، جب کہ متن کے اندر یا حواشی میں ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔اسی طرح متن میں دیے

گئے نمبر شمار اور باب کے آخر میں دیے گئے حواشی بھی باہم مطابقت نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر پہلے باب ہی میں متن میں دِیے گئے حاشیہ نمبر [۸] اور باب کے آخر میں دِیے گئے نمبر شمار [۸] کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ہم نے بڑوں سے سنا تھا کہ اقتباسات نقل کرتے وقت خاص احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ کسی کے الفاظ کو مِن وعَن نقل کیا جائے۔ فاضل مصنف نے یہاں بھی "ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد" کا ثبوت دیا ہے۔ اُنھوں نے "نیا زمانہ نئے صبح وشام پیدا کر" پر عمل پیرا ہوتے ہوئے یہاں بھی جدت پسندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہاں جدت پسندی اپنے لغوی معنوں کے بجائے تساہل پسندی کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ص ۹۵ پر ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا یہ حوالہ نقل کیا گیا ہے:

> "جب لسانی، تحقیق یا علمی سطح پر تفحص وتجسس کے نتیجے میں کسی لفظ کی قرأت کا تعین ہو جائے اور اس کے معنی کی تفہیم میں کوئی اشکال باقی نہ رہے تو اسے تحقیقی تعین کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس میں خصوصیات سے خارجی وسائل کی مدد درکار ہوتی ہے۔"

ہم نے اصل کتاب سے یہ اقتباس دیکھا تو معلوم ہوا کہ "خصوصیات" کی جگہ "خصوصیت" ہے۔ اس بات کا سہرا فاضل مصنف کو جاتا ہے کہ اُن کی اس کتاب کی بدولت ہمیں علوی صاحب کی "اُصولِ تحقیق وترتیبِ متن" کو ایک بار پھر دیکھنے کا موقع مل گیا۔

رشید حسن خاں رموزِ اوقاف کا بہت خیال رکھنے والے محقق تھے۔ قطع نظر اِس سے کہ "طرزِ تحقیق" کے مصنف جناب ڈاکٹر محمد عطاء اللہ نے عبارت نقل کرتے وقت رشید حسن خاں کے استعمال کیے گئے "سکتوں" کا خیال نہیں رکھا، موصوف نے لفظوں کا بھی حلیہ بدل دیا ہے۔ مثال کے طور پر فاضل مصنف نے صفحہ ۲۵ پر یہ جو اقتباس نقل کیا ہے، اُس کا آخری جملہ یوں لکھا ہے:

> "۔۔۔ جن امور پر استدلال کی بنیاد رکھی جائے، وہ اس وقت تک کی معلومات کے مطابق، بہ ظاہر حالات، تک سے بری ہوں اور جن مآخذ سے کام لیا جائے وہ قابلِ اعتماد ہوں۔"

اقتباسِ بالا میں لفظ "تک" پر ہمیں شک گزرا۔ سوچا شاید رشید حسن خاں نے "ٹک" لکھا ہو، مگر پھر بھی دل مطمئن نہ ہوا۔ چناں چہ "ادبی تحقیق۔ مسائل اور تجزیہ" سے رجوع کرنا پڑا۔ معلوم ہوا کہ رشید حسن خاں نے "شک" لکھا تھا جسے فاضل مصنف نے "تک" لکھ دیا۔

اسی طرح ص ۲۵ پر رشید حسن خاں کا اقتباس نقل کرتے ہوئے "لئے" لکھا ہے۔ رشید حسن خاں نے اُردو اِملا پر معرکہ آرا کام کیا ہے۔ اُن کے اقتباس میں "لیے" کو "لئے" لکھنا اُن کی رُوح کو اذیت پہنچانے کے مترادف ہے۔ فاضل مصنف نے جگہ جگہ رشید حسن خاں کو رشید حسن خان لکھا ہے۔ ص ۶۲ پر فاضل مصنف نے کڈن کا ایک اقتباس درج کیا ہے۔ یہ اقتباس ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

" A branch of scholarship which is devoted to the study and analysis of extant texts in order to determine authorship and authentically and where there is a multiplicity of texts of on work, to determine which one is the 'best' or the 'original'

ہمیں انگریزی سے زیادہ شناسائی نہیں، پھر بھی J.A Cuddon کی اے ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز اینڈ لٹریری تھیوری (A Dictionary of Literary Terms and Literary Theory) کو اپنے ایک عزیز کی مدد سے کھلوا کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ مذکورہ اقتباس میں authentically کی بجائے authenticity ہے، اسی طرح texts of on wor کی جگہ texts of one work ہے۔

اسی طرح صفحہ ۷۱ پر ایک انگریزی اقتباس نقل کیا گیا ہے۔ اس میں beyond all others کی بجائے beyond all other نقل کیا گیا ہے۔

صفحہ ۲۴ پر ایک انگریزی اقتباس دے کر اُس کا اُردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ لفظ citation کا ترجمہ "تلاوت" کیا گیا ہے۔ بچپن میں ایک لفظ Recitation سنا تھا، اس کے معنی ہمیں تلاوت بتائے گئے تھے۔ citation کا ترجمہ ہمیں تو آتا نہیں تھا، اس لیے مجبوراً ایک انگریزی خواں دوست کا سہارا لینا پڑا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اس کا سیدھا سادا ترجمہ "حوالہ" کیا جا سکتا تھا۔

ہم نے شروع میں پیش لفظ کی عبارت کا حوالہ دیا تھا اور اُس میں فاضل مصنف کی یہ رائے نقل کی تھی کہ اس کتاب کی مدد سے طالب علم کو عملی کام کی تربیت دی جا سکتی ہے۔ ہمیں فاضل مصنف کی اس

بات سے صدفی صد اتفاق ہے۔ چناں چہ ہم جامعات کے شعبہ ہائے اُردُو کے صدور سے دست بستہ درخواست کریں گے کہ وہ اس کتاب کو ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی کے پروگراموں کے نصاب میں شامل کریں تاکہ طالب علموں کو املا کی درستی کی عملی تربیت دی جا سکے۔ جو طالب علم زیادہ غلطیوں کی نشان دہی کرے، اُسے ہم طلائی تمغا دینے کی سفارش کرتے ہیں۔ جو طالب علم ایسا صفحہ تلاش کرے جس میں کوئی غلطی نہ پائی جائے، اُس کی بھی موزوں حوصلہ افزائی کی جائے۔ بطورِ نمونہ چند غلطیوں کی نشان دہی ہم بھی کیے دیتے ہیں۔

خواجہ ذکریا (خواجہ زکریا) ص ۱۲، ۳۸، صورتِ حلال (صورتِ حال) ص ۱۸، requirs (requires) ص ۲۳، جگ (جگہ) ص ۱۸، چاہئے (چاہیے) ص ۲۴، ۲۶، آراء (آرا) ص ۲۵، کیلئے (کے لیے) ص ۲۶، سچائق (سچائی) ص ۲۶، نہں (نہیں) ص ۲۶، جنہیں (جنھیں) ص ۲۷، حق گئی (حق گوئی) ص ۲۷، کسی دنیوی فائدے کی تلاش نہ ہوتا (کسی دنیوی فائدے کی تلاش نہ ہونا) ص ۲۷، کس حد تک (کسی حد تک) ص ۲۸، کئے (کیے) ص ۲۸، دے (دیے) ص ۲۸، کریت (کرتے) ص ۳۰، انہیں (انھیں) ص ۳۰، نیلکے (نیلے) ص ۳۲، ذکریا یونیورسٹی (بہاء الدین زکریا یونیورسٹی) ص ۳۵، زیرِ نظم مقالے (زیرِ نظر مقالے) ص ۳۶، تاریخی پیدائش (تاریخِ پیدائش) ص ۳۷، زرگشت (زرگزشت) ص ۳۸، نہای (نہایت) ص ۳۸، رموز واوقاف (رموزِ اوقاف) ص ۴۱، کام مواد تلاش کرنا ہو (کام کا مواد تلاش کرنا ہو) ص ۴۴، دوکر (دور) ص ۵۱، اگر ہم محقق متن کی خصوصیات کا تجزیہ کرنے کے خواہش مند ہو (اگر ہم محقق متن کی خصوصیات کا تجزیہ کرنے کے خواہش مند ہوں) ص ۶۲، ترسی (ترسیل) ص ۶۲، ارتقاء (ارتقا) ص ۶۳، ”کیونکر“ کی حدت کو (”کیونکر کی حد تک تو) ص ۶۶، دس بارا (دس بارہ) ۶۸، دوبارا (دوبارہ) ص ۶۸، مطلؑ (مطلع) ص ۶۸، سینن (سنین) ص ۶۹، مت (متن) ص ۶۹، وہی (وہیں) ص ۷۲، اپنی (انھی) ص ۷۲، رحجانات (رجحانات) ص ۷۳، رسالیب (اسالیب) ص ۷۳، اشتقاف (اشتقاق) ص ۷۳، کیمطالعہ (کے مطالعہ) ص ۷۳، تیسرے نقل (تیسری نقل) ص ۷۴، املاء (املا) ص ۷۴، دیئے (دِیے) ص ۷۵، سلطان بخش (سلطانہ بخش) ص ۷۸، کلیہ اسلامیہ اشرفیہ

(کلیہ اسلامیہ وشرقیہ) ص ۸۷، تائج (نتائج) ص ۸۳، رجحان (رجحان) ص ۸۵، ڈکٹر (ڈاکٹر) ص ۸۹، مرحصہ (مرحلہ) ص ۹۳، درست متن کی تعین (درست متن کے تعین/درست متن کی تعیین) ص ۹۴، داخل شہادت (داخلی شہادت) ص ۹۴، ہی (ہیں) ص ۹۴، استرداری (استردادی) ص ۹۵، ۹۶، مرجح (مرجح) ص ۹۶، زمانے کتابت کی تعین (زمانۂ کتابت کے تعین/زمانۂ کتابت کی تعیین) ص ۱۰۰، تکمیل کی تعین (تکمیل کے تعین/تکمیل کی تعیین) ص ۱۰۰، یاداشت (یادداشت) ص ۱۰۱، ۱۱۷، جشخص (شخص) ص ۱۰۱، میر تقی میر۔ حیات سر شاعری (میر تقی میر۔ حیات اور شاعری) ص ۱۰۲، مضروضات (مفروضات) ص ۱۰۲، فارسی سرہندی (فارسی اور ہندی) ص ۱۰۲، تین گناہ زیادہ (تین گنا زیادہ) ص ۱۰۳، اکثر بادشاہ کی تخت نشینی (اکبر بادشاہ کی تخت نشینی) ص ۱۰۳، شاہجہان کے عہدے سے پہلے (شاہ جہان کے عہد سے پہلے) ص ۱۰۳، جالی (جالبی) ص ۱۰۷، یاداشتیں (یادداشتیں) ص ۱۱۰، ۱۳۱، دستاویزا ہیں (دستاویزات ہیں) ص ۱۱۱، تبصرہ اور تنقیدی ثانوی (تبصرہ اور تنقید ثانوی) ص ۱۱۱، می (میں) ص ۱۱۷، مقدہ (مقدمہ) ص ۱۲۳، پوچھ گیا (پوچھا گیا) ص ۱۲۶، غیر سائنس (غیر سائنسی) ص ۱۲۷، ناسب (مناسب) ص ۱۳۸، پاورپی (پاورقی) ص ۱۳۹، titals (titles) ص ۱۴۱۔

زبان کے حوالے سے بھی چند باتیں کھٹکتی ہیں۔ مثلاً صفحہ ۱۰۱ پر لکھا ہے "۔۔۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آسکی"۔ یہاں "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی" لکھنا چاہیے تھا۔

نام ایک ہی سطر میں ہونا چاہیے۔ اب صورت یہ ہے کہ ص ۶۸ کی سطر ۱۲ "قاضی عبد" پر ختم ہوتی ہے اور اگلی سطر "الودود" سے شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک سطر کا خاتمہ "طبع یا" پر ہوتا ہے جب کہ اگلی سطر کا آغاز "زدہم" سے ہوتا ہے (ص ۱۲۷)

ایک مثال کو ایک سے زیادہ مقامات پر درج کرنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ اس سلسلے میں صفحہ ۶۹، ۱۰۲ اور ۱۳۴ ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں، جہاں "میر تقی میر۔ حیات اور شاعری" میں خواجہ احمد فاروقی کے میر کے ایک شعر کی مثال دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ فاضل مصنف چاہتے ہیں کہ بار بار ایک ہی مواد پڑھنے سے قاری کو یہ باتیں خوب ذہن نشین ہوجائیں۔

رپورتاژ نامہ

سولہواں کراچی عالمی کتاب میلہ

سید عزیز الرحمن

۳۰ دسمبر ۲۰۲۱ سے شروع ہو کر ۰۳ جنوری ۲۰۲۲ء تک کراچی کے ایکسپو سینٹر میں کراچی عالمی کتاب میلہ جاری رہا۔ اس میلے میں عوام کی دلچسپی حسب سابق تھی بلکہ سابقہ میلوں سے بڑھ کر ہی محسوس ہوئی، یہ میلہ کرونا کے سبب ایک سال کے وقفے سے منعقد ہوا، اور شمار کے اعتبار سے سولہواں میلہ تھا۔

کتاب کے حوالے سے ہمارا مایوس ذہن نت نئے جملے تراشتا رہتا ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ اب ڈیجیٹل دور میں کتاب کی اہمیت نہیں رہی۔ کبھی کہنے والا یوں کہہ اٹھتا ہے کہ کتاب کی صدی رخصت ہوئی، یا یہ کہ اب پڑھنے والے کہاں رہے۔ لیکن اس میلے نے حسب سابق ان تمام جملوں کو امر واقعی کے خلاف ثابت کر دیا۔ لوگ آئے، بھرپور شرکت رہی، بوڑھوں جوانوں، مرد و خواتین، بچوں اور بچیوں نے بڑھ چڑھ کر اس میلے میں حصہ لیا۔ سب سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ یہ شرکت برائے شرکت نہیں تھی، بلکہ اسٹالوں پر رش تھا، خریداری ہو رہی تھی، کتابوں کا مطالعہ جاری تھا اور لوگ اپنے اپنے ذوق کے مطابق کتاب بینی اور کتاب چینی میں مصروف تھے۔

عالم یہ تھا کہ کہ نمائش کا آغاز صبح ۱۰ بجے ہوا کرتا تھا اور ساڑھے دس بجے سے ہال بلکہ تینوں ہال بھرے پرے نظر آنے لگتے تھے۔ دن میں کئی کئی بار ایسا ہوتا کہ کہ نمائش گاہ میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہ بچتی۔ کرونائی صورت حال اور مہنگائی کے اس عالم میں لوگوں کا جوش و خروش صرف دیدنی نہیں

تھا، حددرجے تعجب خیز بھی تھا اور حیرت انگیز بھی۔ اس پوری مدت میں ہمارا بھی بڑا وقت وہیں گزرا کہ زوار اکیڈمی کا اسٹال بھی وہاں موجود تھا۔ ہم نے اس دوران کیا دیکھا، اس پورے عمل پر ہمارے کیا تاثرات تھے، اس حوالے سے چند نکات ہم ترتیب وار پیش کر رہے ہیں:

☆……عالم یہ تھا کہ ایک خبر کے مطابق (دروغ بر گردن راوی) پہلے ہی روز کوئی بائیس کروڑ روپے کی کتب فروخت ہوئیں۔ یاد رہے کہ بک فیئر کے مزاج کے مطابق روز اول سب سے کم خریداری ہوتی ہے۔ یہ بات تو ہم نے اپنے اسٹال پر بھی دیکھی کہ ہمارے ہاں آنے والے اور خریدنے والے حضرات کی تعداد گزشتہ برسوں کے مقابلے میں کم سے کم دوگنی تھی۔

☆……اس کے ساتھ ساتھ آنے والوں میں خریداری کے حوالے سے موضوعاتی ذوق بھی خوب دکھائی دیا۔ وہ عام طور پر ایک سے زیادہ موضوعات سے دلچسپی رکھتے تھے اور اپنے پسندیدہ موضوعات پر کتب کی تلاش میں رہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے بہت سوں کو مشورہ کرتے ہوئے بھی پایا گیا، کتنے ہی حضرات نے ہم جیسوں سے بھی مشورہ کرنے کی کوشش کی۔

☆……ان قارئین میں ایک بڑی تعداد بچوں کی تھی، ان کے لیے علیحدہ سے اسٹالز بھی موجود تھے اور بچوں کی کتب شائع کرنے والے ناشرین بڑی تعداد میں اپنی کتب کے ساتھ نمائش کا حصہ تھے۔ ان اسٹالوں پر ایک عجیب منظر یہ دیکھنے میں نظر آیا کہ بچے اپنی پسندیدہ کتب خصوصاً تاریخ اور کہانیاں لے کر زمین پر چپک کر اور اسٹالوں پر موجود ریکس سے لگ کر یوں مطالعے میں مصروف تھے کہ ماحول سے بالکل بے خبر نظر آتے تھے۔

☆……ان اسٹالوں پر آنے والوں میں ایک بڑی تعداد دینی مدارس کے فضلا، طلبا اور علما کی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں جہاں ایک بڑی تعداد سنجیدہ اور سینئر اساتذہ کرام کی تھی، وہیں ابتدائی درجات میں پڑھنے والے طلبا بھی بڑی تعداد میں کتب پوچھتے، چنتے اور خریدتے نظر آئے۔ مزید اطمینان کی بات یہ ہوئی کہ یہ طلبا صرف دینی کتب کی طرف راغب نہیں تھے بل کہ تاریخ، فلسفہ، ادب، ناول، شاعری، تنقید، سوانح اور دیگر اہم موضوعات سے دلچسپی لیتے ہوئے اور سنجیدہ ناشرین کی کتب ٹٹولتے ہوئے دکھائی دیے۔

☆......نمائش کی ایک اہم بات سنجیدہ ناشرین کی موجودگی بھی تھی۔ چنانچہ اردو سائنس بورڈ، انجمن ترقی اردو، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اقبال اکیڈمی، ادارہ ثقافت اسلامی، انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز سمیت درسی کتب شائع کرنے والے بڑے بڑے ناشرین موجود تھے۔

☆......ذوق وشوق کا عالم یہ تھا کہ اس میلے کا آغاز جمعرات ۳۰ دسمبر سے ہونا تھا، اور نمائش کنندگان کے لیے ایکسپو سینٹر کے ہال ۲۹ دسمبر کو کھول دیے گیے تھے، تاکہ وہ اپنے اسٹال لگا سکیں اور اپنی کتابیں ڈسپلے کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دن صرف ناشرین اور نمائش کنندگان کا تھا، خریدار اور شائقین کے لیے اگلے روز سے نمائش کو کھولا جانا تھا لیکن اس روز بھی کئی شوق رکھنے والے حضرات نہ صرف یہ کہ ہالوں میں موجود تھے بلکہ ہزاروں کی خریداری افتتاح سے قبل ہی کر چکے تھے۔

☆......نمائش کے پانچوں دن خواتین وحضرات کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی بھی نظر آئی جو یا تو معذور تھے اور کسی کے سہارے سے چل رہے تھے، یا وہیل چیئر پر تھے لیکن ان کے ذوق وشوق کا عالم یہ تھا کہ وہ گھنٹوں اسی ضعف یا معذوری کے عالم میں مختلف ہالوں میں گھومتے رہے اور مختلف اسٹالوں پر کتابیں پسند کرتے رہے۔

☆......نمائش کی ایک خاص بات یہ بھی نوٹ کی گئی کہ نمائش سے نکلتے ہوئے ہر دوسرے شخص کے ہاتھ میں خریداری کی علامت کے طور پر کتب سے بھرے ہوئے لفافے اور تھیلے موجود تھے۔ سوائے طلبہ اور طالبات کے عام طور پر نمائش میں آنے والی اکثریت کتب کی خریداری ضرور کررہی تھی۔

☆......اس سے بھی بڑھ کر اہم ترین بات یہ تھی کہ پوری نمائش کے دوران کتب کی چوری کا کوئی واقعہ عام طور پر سامنے نہیں آیا۔ کسی کا ذاتی تجربہ رہا ہو تو وہ اتفاقی اور انفرادی بات ہوگی۔

☆......ایک بات یہ بھی ہوئی کہ ملک بھر سے کتنے ہی لوگ ایسے نظر آئے جن میں سے بہت سوں سے ملاقات بھی ہوئی جو یا تو خاص اس مقصد کے لیے سفر کرکے یہاں تشریف لائے تھے یا وہ آئے تو اپنی کسی اور دوسری ضرورت کے لیے تھے مگر انہوں نے اہتمام کے ساتھ سفر ان دنوں میں رکھا تھا تاکہ اس نمائش سے بھی استفادہ کرسکیں۔ چنانچہ باہر سے آنے والے جن احباب وحضرات

سے ہماری ملاقات ہوئی ان میں کوئٹہ، ژوب، گوادر، تربت، پھر سندھ میں سانگھڑ، حیدرآباد، سکھر، شکارپوراور پنجاب میں بہاول پور، لاہور، گوجرخان، اسلام آباد، اور کے پی کے میں ڈیرہ اسماعیل خان اور پشاور سے تشریف لانے والے حضرات شامل تھے۔

لیکن ہمیشہ کی طرح اس بار بھی احساس یہ رہا کہ کاش منتظمین اس اہم ترین پروگرام کی میڈیا کوریج کو بھی بہتر بنانے کی کوشش کرتے۔ اس کی تشہیر کرتے اور اے کاش کہ ہمارے میڈیا کے دوست بھی اپنی ذمے داری محسوس کرتے ہوئے اس اہم ترین ایونٹ کو اپنے اخبارات اور چینلز پر قرار واقعی جگہ دیتے۔ لیکن قدرت کا اپنا نظام ہے، اس کوتاہی کی تلافی یوں ہوئی کہ ہمارے نوجوانوں کا حد سے زیادہ بڑھا ہوا سیلفی کا شوق اس کمی کو پورا کرنے میں کام یاب رہا۔ اور نمائش میں آنے والے حضرات کی سیلفیوں کی وجہ سے سوشل میڈیا پر ایک ہنگامہ سا بپا رہا۔ اس طرح اس نمائش کے آغاز کے بعد بھی جو اس سے لاعلم تھے، وہ واقف ہوتے چلے گئے اور لوگوں کے نمائش میں آنے کا سلسلہ تواتر سے جاری رہا۔ اگر منتظمین اس جانب توجہ کرتے اور آئندہ بھی اس کا اہتمام کریں تو نمائش میں آنے والے افراد کی تعداد میں بھی اضافہ ممکن ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کے نتیجے میں کتب کی فروخت میں بھی اضافہ ہوگا۔

نمائش کا دوسرا قابل توجہ پہلو اسٹال کی قیمت ہے۔ یہاں اس بار وقت سے پہلے اسٹال بک کرانے والوں کو ایک چھوٹا سا اسٹال، جو عام نوعیت کے ناشر کے لیے کافی بھی نہیں ہوتا، ستر ہزار کا ملا۔ شاید آخری وقت میں بک کرانے والوں کو اس سے بھی زیادہ ادائیگی کرنی پڑی ہو۔ کتاب کا شائق جو ایکسپو سینٹر میں آ رہا تھا، کتاب اور کتابی دنیا کے چلن سے پوری طرح واقف تھا، اس لیے اس کی خواہش تھی کہ اسے کتاب کم از کم ۵۰ فیصد رعایت پر میسر آئے۔ کوئی پبلشر ایک چھوٹے سے سٹال پر تمام اخراجات کے ساتھ ایک لاکھ روپے پانچ دن کے صرف کر کے اگر ۵۰ فیصد رعایت پر کتاب فروخت کرے گا تو اسے آخر فائدہ کیا حاصل ہوگا۔ ہم جیسے خاص معیار اور خاص موضوعات پر کتب شائع کرنے والوں کے لیے تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے اسٹال کا خرچہ کتابوں کی فروخت سے

نکال سکیں۔ہم جیسے چند ایک اداروں کا تو ویسے بھی استثنیٰ اس لیے ضروری ہوگا کہ ہم ایک ٹرسٹ کے تحت ایک دعوتی اسپرٹ کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں، ہماری دلچسپی میں فروخت شدہ کتب کی آمدنی تو چوتھے پانچویں نمبر پر آتی ہے، اصل مقصود تو قارئین تک کتاب کو پہنچانا ہے۔لیکن یہ بہر حال ایک تجارتی سرگرمی تھی ،ایسے میں ان پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جن کے ذریعے ناشرین کو مالی منفعت بھی ممکن ہوتا کہ یہ سلسلہ دراز ہو سکے اور کتاب بینی اور کتاب داری کا ذوق پروان چڑھ سکے۔

اسی طرح عام نمائشوں کے مزاج کے عین مطابق ہمیشہ سے ان پانچ ایام میں کچھ سرگرمیوں کی بھی روایت رہی ہے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی دو تین کتب کی تقریب اجرا عمل میں لائی گئی لیکن اس مقصد کے لیے جو جگہ متعین کی گئی ہے، وہ اس قدر ناکافی اور نامناسب ہے کہ وہاں پر منعقد ہونے والی تقاریب کا کوئی فائدہ محسوس نہیں ہوتا۔انتہائی شور شرابے کے عالم میں کیسے کوئی بات کرسکتا ہے اور کیسے اس کی بات سنی جاسکتی ہے۔حتیٰ کہ ان تقریبات کے شروع ہونے سے قبل شائقین کو مطلع کرنے کے لیے جو اعلانات کیے جاتے ہیں، وہ بھی پوری طرح قابل سماعت نہیں ہوتے۔

یہی عالم ایکسپو سینٹر کی اوپر گیلریوں میں موجود کھانے پینے کے اسٹال کا ہوتا ہے۔وہ بھی نہایت مہنگے داموں بیچے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انتہائی کم معیار کا کھانے پینے کا سامان انتہائی مہنگے داموں میسر ہوتا ہے، اور طرفہ یہ کہ وہاں سکون سے بیٹھ کر کھانے کی جگہ بھی میسر نہیں ہوتی۔

اب تک یہ معمول رہا کہ خواتین اور مرد حضرات کے لیے ایکسپو سینٹر سے باہر نکلنے سے پہلے ہی اوپر کی جانب نماز اور وضو کا اہتمام موجود تھا۔شاید رش کی وجہ سے اس بار یہ کیا گیا کہ مردوں کے لیے نماز کا اہتمام سینٹر سے باہر کھلی جگہ پر ٹینٹ لگا کر کیا گیا تھا۔اس کے باوجود وضو کا اہتمام اندر ہی تھا اور وہ جگہ محدود تر تھی۔اس پورے عمل میں ایک قباحت یہ بھی نظر آئی کہ نماز کے لیے باہر جانے والوں کو دوبارہ قطار بنا کر ہال میں داخل ہونا پڑتا تھا۔اس بنا پر آئندہ کے لیے ایکسپو سینٹر کے منتظمین کو اس جانب توجہ دلانی چاہیے کہ وہ وضو اور نماز کی جگہ مجمع کے مطابق متعین کریں اور اس کا خاص اہتمام فرمائیں۔

☆......☆......☆

تعلیم وتربیت

عربی زبان ایسے سیکھئے جیسے مادری زبان

مولانا محمد طلحہ بلال احمد منیار

[مولانا محمد طلحہ بلال احمد منیار کا تعلق سورت، گجرات (بھارت) سے ہے، آپ ایک عرصہ سعودی عرب میں مقیم رہے، آپ نے مکہ مکرمہ میں حرم کے جماعتِ تحفیظ القرآن کے حلقے میں قرآن مجید کا حفظ مکمل کیا، مکہ ہی میں تجوید ولہجات کی تعلیم حاصل کی اور حرم کے ایک حلقہ کے استاذ مقرر ہوئے، بعدازاں آپ نے ریاض کی یونیورسٹی جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ سے **تخصص في الحديث و علومه** کی ڈگری ممتاز درجے سے حاصل کی، آپ کو چار سال عالم عرب کے مشہور عالم ومحقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ سے کسبِ فیض کا شرف حاصل رہا، سورت واپسی پر آپ "مدرسہ ملا مسجد" کے نگران مقرر ہوئے، ہندو پاک میں آپ کا شمار قرآن وحدیث کے چوٹی کے ماہرین میں ہوتا ہے، آپ کے علمی وتحقیقی مضامین النخیل کی زینت بنتے رہیں گے، ان شاء اللہ۔ ادارہ]

مادری زبان کیوں ہم آسانی سے سیکھنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، جبکہ مدارس کی چہاردیواری میں کئی سالوں کی جدوجہد ومحنت کے باوجود عربی زبان پر معتد بہ قدرت حاصل نہیں ہوتی ہے؟

اس کے لیے ہمیں غور کرنا ہوگا کہ ہم مادری زبان سیکھنے کے لیے کیسا ماحول بناتے ہیں، اُس ماحول میں وہ کونسی چیزیں ہیں جو زبان سیکھنے میں معین ومددگار بنتی ہیں، جن سے مدرسہ یکسر خالی ہوتا ہے یا کافی حد تک ہمارے مدرسوں میں ان معاون چیزوں کی کمی پائی جاتی ہے۔

میں نے اس سلسلے میں غور وخوض کرنے کے بعد چند پوئنٹس/ نکات نوٹ کیے ہیں، امید ہے کہ ان کا پیش کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا:

(۱)...... بولنے (تکلم) کی طبعی عمر سے پہلے بچہ ایک طویل مدت تک صرف سننے (سماعت) کے

ماحول میں جیتا ہے۔آج کل انگریزی زبان سکھانے والے اس پر پورا زور دیتے ہیں کہ: پہلے آپ ایک مدت تک روزانہ چند گھنٹے صرف انگریزی سنیں، چاہے آپ کو مطلب سمجھ میں نہ آئے، سننے کے لیے کسی مواد کا کوئی متعینہ انتخاب بھی ضروری نہیں ہے۔ سنتے سنتے الفاظ سے جب انسیت بڑھے گی تو رفتہ رفتہ خود بخود سیاق وسباق سے عام مفہوم سمجھنے کی صلاحیت بڑھتی رہے گی۔

مدارس میں عربی سنانے کا ماحول کہاں ہے؟ وہاں تو بلاوجہ بھی ہر چیز کا اردو ترجمہ سنانے کا ماحول بنا ہوا ہے۔خارج درس بھی عربی کون بولتا ہے؟ رہ گئی ''النادی العربی'' میں رٹی رٹائی تقریروں کا سلسلہ،تو ان کا فائدہ بھی محدود بلکہ محدود تر ہوتا ہے۔

(۲)...... مادری زبان کا ماحول صرف چند گھنٹے یا چند پیریڈ کے لئے نہیں ہوتا بلکہ چوبیس گھنٹے کے لیے بنا ہوا ہوتا ہے یعنی (**وجود بیئۃ التکلم باستمرار**) کی وجہ سے سیکھنے کا لمبا وقت ملتا ہے۔

(۳)......ایک ہی بات بکثرت اور مختلف پیرایوں میں روزانہ کان میں پڑتی ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ آج کا سبق جملہ خبریہ،کل کا جملہ فعلیہ، پرسوں مرفوعات،منصوبات...... کثرتِ تکرار سیکھنے کے کام کو آسان بنا دیتی ہے۔

(۴)......مفرد الفاظ کے بجائے ہر بات پورے پورے جملوں میں بولی جاتی ہے،اور جملوں کے بار بار سننے سے مشکل الفاظ خود بخود سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔اگرچہ بچہ سوالات بھی کثرت سے کرتا ہے، لیکن ہر مشکل لفظ کے بارے میں استفسار نہیں کرتا۔

(۵)......مواقع استعمال کا تنوع بھی مادری زبان کے سیکھنے میں اہم رول ادا کرتا ہے، صبح سے لیکر رات تک ہر قسم کا ماحول ملتا ہے: سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، آنا جانا، کھیلنا کودنا، نہانا دھونا، چیخنا چلانا، رونا دھونا، مارنا پیٹنا، مانگنا دینا، ملنا جلنا...... ہر طرح کی پوزیشن کے ضروری ضروری الفاظ کے استعمال کا ماحول وموقع ملتا رہتا ہے۔لفظ جب اس کے طبعی ایکشن میں استعمال ہوتا ہے تو وہ سیکھنے میں زید وعمرو کی مثالوں سے زیادہ بہتر معاون بنتا ہے۔

(۶)......اسی سے جڑا ہوا ایک اور اہم پوائنٹ یہ بھی ہے کہ جملوں کا استعمال ان کے طبعی ایکشنوں کے ذریعے ہوتا ہے،خوشی غمی، دکھ درد، بھوک پیاس، ڈر گھبراہٹ،خوشنودی ناراضگی، سردی گرمی، یہ سب حقیقی

شکلوں میں ہوتا ہے۔مزید یہ بھی ہے کہ بہت سی مرتبہ خود بچہ ان سب ایکشنوں کا ہیرو ہوتا ہے۔

(۷)...... بات چیت زیادہ تر محادثہ وتخاطب کی شکل میں ہوتی ہے، ماں باپ، بھائی بہن، دیگر اہل خانہ، رشتے دار، میزبان مہمان، نوکر چاکر وغیرہ سب ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے ہوئے مادری زبان بولتے ہیں۔گاؤ تکیے پر ٹیک لگا کر کسی چیز کا رٹا نہیں لگایا جاتا۔اور نہ فرضی قصے سنائے جاتے ہیں۔

(۸)......فرضی مثالوں سے نہیں بلکہ سیکھنے کا پورا ماحول محسوسات کی شکل میں موجود ہوتا ہے، ہر چیز کے بارے میں جو بھی بات ہوتی ہے تو وہ دائرہ حس میں ہوتی ہے، دیکھی جاتی ہے، پکڑی جاتی ہے، چکھی جاتی ہے، سنی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مادری زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

کھانے کی بات دسترخوان پر کھانا تناول کرتے ہوئے، لینے دینے کی بات بازار میں خرید وفروخت کرتے ہوئے، ملنے جلنے کی بات مہمان خانے میں میزبان ومہمان کے درمیان، کھیلنے کودنے کی بات اس کے میدان میں ......الغرض یہ کہ ہر چیز متحرک وجاندار، اور طبعی جذبات سے بھرپور محسوس کی جاتی ہے۔صرف بے جان الفاظ و جملے نہیں بولے جاتے۔

(۹)...... جملے فطری طور پر بلا تصنع وتکلف برجستہ بولے جاتے ہیں، اور وہ جملے اس ایکشن وماحول کے مناسب روزمرہ کے مستعمل الفاظ میں سے ہوتے ہیں، قوامیس سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر، اور گرامر کے اصولوں کو سوچ سوچ کر باقاعدہ بنائے نہیں جاتے۔بچہ بھی کوئی باقاعدہ گرامر نہیں سیکھتا ہے، بلکہ فطری ماحول میں رہنے کی وجہ سے اس میں اتنا شعور پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ مفرد جمع، مذکر مؤنث، متکلم حاضر، فاعل مفعول، جملہ خبریہ فعلیہ سب کی تمیز کرنے لگتا ہے۔

(۱۰)...... بولنے میں کسی قسم کی غلطی کے وقوع یا اس پر گرفت کا خوف یا بوجھ ذہن پر سوار نہیں ہوتا ہے، بلکہ بچے کو غلط بولنے پر بھی شاباشی سے اور حوصلہ افزائی سے نوزا جاتا ہے، جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ کھل کر پوری حریت سے بولتا ہے۔

(۱۱)...... مادری زبان بولنے والوں سے انسیت ہوتی ہے، ماں باپ، بھائی بہن، دادا دادی، نانا نانی، چچا چچانی، ماموں خالوں، ہم عمر بچے، وغیرہ سب سے انسیت ہوتی ہے اور ماحول بھی فری ہوتا ہے، تعلیم وتعلم یا استاذ وشاگرد کے رشتے کا کوئی تصور نہیں ہوتا ہے۔

(۱۲)......ایک آخری پوئنٹ یہ ہے کہ سیکھنے کی زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ نہیں کیا جاتا، بلکہ مسلسل ایک ہی زبان بولی جاتی ہے،اور بولتے بولتے سنتے سنتے خودبخود وہ زبان آجاتی ہے۔

یہ چند امور وہ ہیں جن سے ہر بچہ بہت جلدی اپنی مادری زبان فرفر بولنے پر قدرت حاصل کرلیتا ہے، جب کہ مدارس میں ان سب امور کا پایا جانا یا مہیا کرنا دشوار ہوتا ہے، اس لئے زبان سیکھنے کا کام اثر نہیں دکھلاتا۔مدارس میں اگر مذکورہ بالا امور میں سے صرف چند امور کے عملی اجراء کا بسہولت ماحول بنایا جائے، توامید ہے کہ عربی زبان کے سیکھنے کا کام بہت مفید موئثراورآسان ہوجائے۔

لیلۃ السبت ۱۵ینایر ۲۰۲۲

ماہنامہ النخیل اردو زبان وادب کا ترنم

اردو ادب کا تذکرہ چھڑے اور مولانا ابن الحسن عباسی علیہ الرحمہ کا ذکرِ ادب نہ ہو ایسا ممکن نہیں،تو ایسا کیوں؟اس لیے کہ انہوں نے حروف کو جملوں میں بدل کر تحریر ہی نہیں کیا بلکہ زندہ ضمیر لوگوں کے دل ودماغ پر ان مچلتے ہوئے حروف اور احساسات کے نور سے چمکتے ہوئے جملوں کو نقش کیا ہے۔کہنے کو تو ان کا جاری کردہ ماہنامہ"النخیل"اپنے ثمرات سے اردو زبان کے نخلستان کو آباد کر ہی رہا ہے،مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی ہر تحریر اور ہر کتاب النخیل ہے۔مولانا محمد بشارت نواز صاحب نے جس طرح مولانا ابن الحسن عباسی علیہ الرحمہ کی محنتوں کو تسلسل دیا ہے، اس سے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے کہ کس اعلیٰ نمونے پر انہوں نے اپنے استاذ علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ کے کاموں کی تکمیل کی کہ پوری دنیا کے لیے ایک مثالی کارنامہ ثابت ہوا۔اس بات سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے:"**تلک الایام نداولھا بین الناس**"

بات یہ ہے کہ ماہنامہ"النخیل"نخلِ ادب وتحقیق کی آبیاری کرنے کے لیے دیگر جرائد سے ایک منفرد اوراچھوتے انداز ومعیار کی صلاحیت رکھتا ہے،قدردانِ علم وادب اور وابستگانِ تحقیق صدائے نخیل کو سمجھنے میں دیر نہ کریں، کیونکہ اس کی صدا میں اردو زبان وادب کا وہ ترنم موجود ہے جو بیخودی نہیں بلکہ خودی کا ترجمان بن کر نسلِ آدم کو اپنے بھولے بسرے اسباق کی یاددہانی کرواتا ہے۔

مولانا طارق علی عباسی

علم وتحقیق

دعا رجب کا تحقیقی جائزہ

مفتی غلام مصطفی معاویہ
متخصص جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن

ماہ رجب کا شمار حرمت والے مہینہ میں ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد مبارک ہے: **إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ** [سورة الأنفال:۳۶]

ترجمہ: "بیشک مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک اللہ کی کتاب میں بارہ مہینے ہیں جب سے اس نے آسمان اورزمین بنائے، ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں"۔

اسی طرح بخاری شریف میں حضرت ابوبکرة رضی اللہ عنہ سے روایت منقول ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **الزمان قد استدار كهيئته يوم خلق الله السماوات والأرض السنة اثنا عشرا شهرا منها أربعة حرم، ثلاثة متواليات ذو القعدة، وذو الحجة، والمحرم، ورجب مضر الذي بين جمادى وشعبان (الصحيح البخاری (۳/ ۱۱۶۸، رقم الحدیث: ۳۰۲۵)۔**

ترجمہ: "دیکھو زمانہ پھر اپنی پہلی اسی ہیئت پر آ گیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو پیدا کیا تھا۔ سال بارہ مہینے کا ہوتا ہے، ان میں سے چار حرمت والے مہینے ہیں۔ تین لگا تاریعنی ذی قعدہ، ذی الحجۃ اور محرم اور چوتھا رجب مضر جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان میں پڑتا ہے"۔

اس آیت اور حدیث شریف سے اس ماہ کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رجب کا نام اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کی پیدائش کے وقت ہی رکھ دیا تھا۔

ماہ رجب کی وجہ تسمیہ: اس کی عظمت میں مزید اضافہ کرتی ہے کہ رجب ترجیب سے ماخوذ ہے اور

ترجیب کا معنی ہے: عظمت والا ہونا؛ جیسا کہ علامہ ابن الاثیر جزریؒ نے "النهاية في غريب الاثر" میں اس کی وضاحت یوں کی ہے: "ومنه سمي شهر رجب لأنه كان يعظم"۔

ترجمہ: "اور زمانہ جاہلیت میں اس مہینہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس لیے اس کا نام رجب رکھا گیا"۔

یہ چار ماہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں بھی بڑی برکت کا باعث تھے، اس لیے اللہ نے ان کی عظمت کو اسی طرح برقرار رکھا۔ چونکہ زمانہ جاہلیت میں اس ماہ کی بہت قدر کی جاتی تھی، اس لیے ماہ رجب کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور ہوئیں اور بہت سی من گھڑت احادیث اس ماہ کی فضیلت میں بیان ہونا شروع ہوگئیں، بہت سی خرافات نے اس مہینہ میں جنم لیا، جن کا سد باب علماء وقتاً فوقتاً کرتے رہے، چنانچہ ماہ رجب کے استقبال میں ایک حدیث بیان کی جاتی ہے، حدیث کا متن حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو کہ درج ذیل ہے:

عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا دخل رجب قال: "اللهم بارك لنا في رجب، وشعبان، وبلغنا رمضان"۔

ترجمہ: "انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب رجب کا مہینہ داخل ہوتا تو فرماتے: "اے اللہ! ہمارے لیے رجب اور شعبان میں برکت عطا فرما دیجیے اور مجھے رمضان تک پہنچا دیجیے"۔

یہ روایت مختلف کتب حدیث میں وارد ہوئی ہے، اب اس روایت کی حیثیت کیا ہے اور اہلیان حدیث اس روایت کو کو کیا درجہ دیتے ہیں؟ ذیل میں اس کو بیان کیا جائے گا جس سے قارئین کے سامنے اس روایت کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

یہ روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور حضرت انس سے روایت کرنے والے صرف زیاد بن عبد اللہ النمری ہیں اور زیاد سے روایت کرنے والے صرف زائدۃ بن ابی الرقاد ہیں پھر زائدہ سے ان کے کئی شاگردوں نے روایت کی ہے، گویا اس سند کا مدار زائدۃ بن ابی الرقاد ہیں۔

۱ ......**روایت کی تخریج:** اس روایت کو عبد اللہ بن احمد بن حنبلؒ نے زوائد مسند (۴/۱۸۰ رقم الحدیث: ۲۳۴۶)، ابن السنیؒ نے عمل الیوم واللیلۃ (ص: ۶۱۰ رقم الحدیث: ۶۵۹) میں، ابوبکر

خلالؒ نے فضائل رجب (ص:۴۵) میں، اور امام بیہقیؒ نے شعب الایمان (۵/ ۳۴۸ رقم الحدیث: ۳۵۳۴) میں زائدۃ سے ان کے شاگرد عبید اللہ بن عمر القواریری کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ امام طبرانیؒ نے طبرانی، کتاب الدعاء (ص: ۲۸۴)، اور ابو نعیم الاصبہانیؒ نے حلیۃ الاولیاء (۶/ ۲۹۲) میں زائدۃ سے ان کے شاگرد محمد بن ابی بکر المقدمی کے حوالے سے نقل کی ہے۔

امام طبرانیؒ نے المعجم الاوسط (ص:۴/ ۵۵۸) میں یہ روایت زائدۃ کے شاگرد عبد السلام بن عمر الجنی سے نقل کی ہے۔ امام بزارؒ نے مسند (۱۳/ ۱۱۷) میں یہ روایت زائدۃ کے شاگرد احمد بن مالک القشیری کے حوالے سے نقل کی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ سند زائدۃ سے آگے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک متفرد ہے، اور اس کا تابع موجود ہے نہ ہی کوئی شاہد موجود ہے۔

۲......روایت کے الفاظ: مذکورہ تمام راویوں نے یہ حدیث: ”اللهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي رَجَبٍ وَشَعْبَانَ ، وَبَلِّغْنَا رَمَضَانَ“ کے الفاظ سے نقل کی ہے۔ سوائے عبد اللہ بن احمد کے، انہوں نے ”زوائد المسند“ میں دوسرے جملے کو ”وبارک لنا في رمضان“ کے الفاظ سے نقل کیا ہے۔

اسی طرح بعض روایتوں میں اس دعا کے اخیر میں جمعہ کے دن کی فضیلت بھی درج ذیل الفاظ کے ساتھ وارد ہوئی ہے: ”كَانَ يَقُولُ: إِنَّ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ لَيْلَةٌ غَرَّاءُ، وَيَوْمَهَا يَوْمٌ أَزْهَرُ“

ترجمہ: ”اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ جمعہ کی رات ایک مہم جوئی کی رات ہے اور اس کا دن پھولوں کا دن ہے“۔ یہ الفاظ ”زوائد المسند“، ”عمل الیوم واللیلۃ“، ”الدعوات الکبیر“ اور ”مسند البزار“ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

۳......روایت کا حکم: یہ روایت شدید ضعیف ہے اور اس کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسبت کر کے بیان کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ سند میں دو راوی ضعیف ہیں اور دونوں کا تفرد بھی ہے، نیز اس سند کو خصوصی طور پر غیر معتبر قرار دیا گیا ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

زائد بن ابی الرقاد کے متعلق ائمہ کا کلام:

قال ابو حاتم: يحدث عن زياد النميري عن أنس أحاديث مرفوعة منكرة، ولا ندري منه أو من زياد، ولا أعلم روى عن غير زياد فكنا نعتبر بحديثه (كتاب الجرح والتعديل: ۳/ ۲۱۳)۔

وقال ابوداود: لا أعرف خبره (سؤالات الاجری، ص:۱۱۶)۔

وقال النسائی: لا أدري من هو (النسائی، سنن الکبریٰ ۸/۱۹۶، رقم الحدیث: ۷۸۹۴)۔

حدثني محمد بن عثمان بن أبي شيبة ،سمعت علي بن المديني قال: زائدة بن أبي الرقاد روى مناكير (الضعفاء الكبير، حرف الزاء: ۲/۸۱)۔

قال البخاری: زائدة بن أبي الرقاد، عن زياد النميري وثابت، منكر الحديث (تاريخ الكبير، حرف الزاء: ۳/۳۵۸)۔

قال ابن حبان: يروي المناكير عن المشاهير، لا يحتج به ولا يكتب إلا للاعتبار (المجروحين من المحدثين: ۱/۳۰۸)۔

مذکورہ بالا اقوال کی روشنی میں معلوم ہوا کہ زائدۃ بن ابی الرقاد ضعیف ہے، خاص طور پر یہ زیاد بن عبداللہ النمر ی سے منکر روایات بیان کرتے ہیں، اورزیر بحث روایت بھی انہی سے منقول ہے، تو یہ جرح مخصوص ہے، اور بالفرض زائدہ کے بارے میں کہے گئے دیگر جروحات کا اعتبار نہ بھی کریں، تب بھی یہ روایت جرح مخصوص کی بنا پر ضعیف ہوگی۔

زیاد بن عبداللہ النمر ی کے متعلق ائمۃ کا کلام: اس روایت کی سند میں زیاد النمیر ی بھی ہے، جس پر ضعف وعدم اعتماد کا حکم لگایا گیا ہے:

قال یحییٰ بن معین: ضعيف الحديث (ابن معين، تاريخ ابن معين: ۴/۱۰۵)۔

وقال ابوحاتم: يكتب حديثه، ولا يحتج به (ابن ابی حاتم: ۳/۵۳۶)۔

وقال أبوعبید الآجري: سألت اباداود عنه فضعفه (سؤالات الاجری، ص ۱۸۶)۔

وقال ابن حبان فی المجروحین: منكر الحديث ، يروي عن أنس أشياء لا تشبه حديث الثقات، لا يجوز الاحتجاج به (المجروحين من المحدثين: ۱/۳۰۶)۔

وقال الدارقطنی: ليس بالقوي (سنن الدار القطني: ۲/۱۹۰)۔

وقال ابن حجر: ضعيف (تقريب التهذيب، ص: ۲۵۵)۔ اگرچہ حافظ ابن عدیؒ کی رائے زیاد کے بارے میں معتدل ہے، حافظ ابن عدی فرماتے ہیں:

”ولزياد النميري غيرُ ما ذكرت من الحديث عن أنس، والذي ذكرت له من الحديث

مَن یرویه عنه فیه طعنٌ، والبلاء منهم لا منه، وعندي: إذا رَوَى عن زیاد النمیري ثقةٌ فلا بأس بحدیثه" (الکامل فی الضعفاء: ۴/ ۷۲)۔

مگر یہاں بھی (اذا روی عنه ثقة) کی قید مفقود ہے، کیونکہ زائدہ بن ابی الرقاد ثقہ نہیں ہے۔

۴......**روایت کے بارے میں علماء حدیث کی رائے:** علماء حدیث عموماً اس روایت کے ضعف کے قائل ہیں، پھر ان میں سے بعض نے ضعف کی وجہ سند میں کسی راوی کا تفرد، یا متن کی غرابت یا راوی کا ضعف بتا کر بیان کی ہے اور دیگر حضرات نے اجمالاً حدیث یا سند کو ضعیف قرار دیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

امام طبرانی نے "المعجم الاوسط" میں اور امام بیہقی نے "شعب الایمان" میں زائدہ کے تفرد کی تصریح کی ہے: قال البیهقي في "شعب الإیمان" (۵/ ۳۴۸): تفرد به زیاد النمیري وعنه زائدة بن أبي الرقاد قال البخاري: زائدة بن أبي الرقاد عن زیاد النمیري منکر الحدیث۔

قال الطبراني في "المعجم الأوسط" (ص: ۲۸۴): لا یروی هذا الحدیث عن رسول الله - صلی الله علیه وسلم - إلا بهذا الإسناد، تفرد به: زائدة بن أبي الرقاد۔

حافظ ذہبیؒ نے اس روایت کو میزان الاعتدال میں زائدہ کی منکر روایات میں شمار کیا ہے (۲/ ۶۰)، اور علامہ ہیثمیؒ نے "زائدہ" کو منکر الحدیث بتایا ہے (مجمع الزوائد ۲/ ۱۶۵)۔

اور باقی حضرات نے اجمالاً اس حدیث کے ضعف کو بیان کیا ہے:

امام نوویؒ فرماتے ہیں: حلیة الاولیاء میں ضعیف سند کے ساتھ مروی ہے۔ (الاذکار، ص: ۳۲۹)۔

ابوشامہؒ نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ (الباعث علی انکار البدع والحوادث، ص: ۴۷)

ابن رجبؒ نے بھی اس سند کو ضعیف بتایا ہے۔ (لطائف المعارف، ص: ۱۲۱)

شیخ طاہر پٹنیؒ فرماتے ہیں: یہ روایت سندِ ضعیف سے مروی ہے (تذکرة الموضوعات، ص: ۱۱۷)۔

امام لکھنویؒ نے بھی اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (الاثار المرفوعة، ص: ۵۹)۔

متاخرین میں سے شیخ احمد محمد شاکر (تحقیق مسند احمد)، شیخ شعیب الارنؤوط (تحقیق مسند احمد) نے بھی سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔

خلاصہ: مذکورہ بالا تمام شواہد کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایت اس سند کے ساتھ شدید ضعیف ہے اور اس

کے ضعیف ہونے کی چند وجوہات ہیں:

۱......زائدہ بن ابی الرقاد کا مجروح ہونا۔ ۲......زیاد النمیری کا مجروح ہونا۔ ۳......سند اور متن میں ان دونوں کے تفرد کا پایا جانا۔ ۴......جرح مخصوص کا اس روایت میں پایا جانا (یعنی امام بخاریؒ کا اس سند کو منکر قرار دینا)۔ ۵......محدثین کا اس سند کے ضعیف ہونے پر اجماع۔

لہٰذا اس روایت کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کر کے بیان کرنے سے بچا جائے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "**من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ فی النار**"

ترجمہ: "جس نے جان بوجھ کر میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کی وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے"۔

البتہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیے بغیر بطور دعا کے پڑھا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، چنانچہ ہمارے اکابرین سے اس طرح کی دعائیں منقول ہیں جو وہ رمضان کے استقبال میں مانگا کرتے تھے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے **لطائف المعارف** میں معلیٰ بن فضل کے حوالے سے سلف صالحین کی دعا کا تذکرہ کیا ہے کہ سلف صالحین چھ ماہ پہلے ہی رمضان المبارک کے لیے دعا کیا کرتے تھے لکھتے ہیں:

"قال معلی بن الفضل: کانوا یدعون اللہ تعالی ستة أشهر أن یبلغهم رمضان ویدعونه ستة أشهر أن یتقبل منهم" (لطائف المعارف، ص:۱۴۸)۔

ترجمہ: "معلیٰ بن فضل نے فرمایا: سلف صالحین چھ ماہ اللہ سے دعا کرتے کہ یا اللہ! ہمیں ماہ رمضان نصیب فرما اور چھ ماہ یہ دعا کرتے کہ ہم نے جو عبادتیں کیں وہ قبول فرما"۔

یحیی بن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ سلف صالحین کی یہ دعا ہوا کرتی تھی: "**اللهم سلمني إلی رمضان وسلم لي رمضان وتسلمه مني متقبلا" (لطائف المعارف، ص:۱۴۸)**

ترجمہ: "اے اللہ، مجھے رمضان تک پہنچا اور رمضان کو مجھ تک پہنچا، اور مجھ سے اس میں کئے گئے اعمال قبول فرما"۔

چنانچہ ان الفاظ کو بطورِ دعا کے ماہ رجب سے پہلے یا رجب میں پڑھا جا سکتا ہے، اگر کوئی مسلمان یہ دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! مجھے ماہ رمضان نصیب فرما تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے البتہ اس کو بطور حدیث کے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسبت کر کے بیان کرنا درست نہیں۔ **واللہ اعلم بالصواب**

مسافرانِ آخرت

مولانا افتخار احمد اعظمی رحمۃ اللہ علیہ

دارالعلوم کراچی کے قدیم استاذ مولانا افتخار احمد اعظمی رحمۃ اللہ علیہ ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۳ھ بمطابق ۲۳ دسمبر ۲۰۲۱ء کو کئی ماہ مختلف عوارض میں مبتلا رہ کر تقریباً ۸۲ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ آپ طویل عرصہ دارالعلوم کے درجاتِ علیا کی کئی کتابوں کے استاذ اور جامعہ کے دارالقرآن اور مطبخ کے ناظم بھی رہے۔ آپ ایک کامیاب مدرس اور بہترین منتظم تھے، آپ نہ صرف بہترین تدریسی اور اعلی انتظامی صلاحیتوں کے جامع تھے بلکہ تدریس اور انتظام کی ان بڑی اور بھاری ذمہ داریوں کے ساتھ عبادت کا خاص ذوق بھی حاصل تھا، آپ کے اہلِ خانہ کے بقول آپ رات کے آخری پہر ہمیشہ قرآن مجید کی تلاوت اور ذکر میں مشغول رہتے۔ آپ کو قرآن سے بے حد لگاؤ تھا، دن بھر اپنے فرصت کے اوقات میں تلاوتِ قرآن کریم کرتے رہتے۔ آخر عمر تک رمضان المبارک میں روزانہ ایک قرآن مجید ختم کرنے کا معمول رہا۔

آپ کی پیدائش ۱۹۴۲ء میں اعظم گڑھ (یوپی) میں ہوئی، ۱۹۵۵ء میں اپنے والد کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی اور کراچی میں مقیم ہوئے، دیگر مدارس میں ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ۱۹۵۹ء میں جامعہ دارالعلوم کراچی میں داخل ہوئے اور ۱۹۶۳ء میں سندِ فراغت حاصل کی اور دارالعلوم میں ہی مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۱ء تا ۱۹۸۹ء اپنے سسر مولانا عبدالواحد صاحب کے اصرار پر آپ اپنے اساتذہ کی اجازت سے جامعہ حمادیہ شاہ فیصل کالونی کراچی میں استاذ رہے۔ بعد ازاں آپ واپس اپنی مادرِ علمی میں تشریف لائے اور تادمِ آخر دارالعلوم میں مقیم رہے۔

آپ کی نمازِ جنازہ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم کی اقتدا میں ادا کی گئی، تدفین دارالعلوم کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ کامل مغفرت فرمائے۔

کتب نما

نقش برسنگ (کچھ خراج تحسین، کچھ خراج عقیدت)

[ماہنامہ النخیل میں کتابوں پر تبصروں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے، النخیل میں کتاب کے موضوع کے اعتبار سے ماہر فن مبصرین سے تبصرے لکھوائے جاتے ہیں۔ تبصرے کے لیے کتابیں "ادارہ تراث الادب" کے پتے پر بھیجی جائیں۔ ادارہ]

نام کتاب	:	نقش برسنگ (کچھ خراج تحسین، کچھ خراج عقیدت
مصنف	:	سہیل انجم
ملنے کا پتا	:	6A/370 ذاکر نگر، نئی دہلی 110025
مبصر	:	عمیر منظر۔ مانو لکھنؤ کیمپس۔ لکھنؤ

سہیل انجم کا شمار ہندستان کے ممتاز صحافیوں میں ہوتا ہے۔ پرنٹ اور الیکٹرانٹ دونوں سے ان کی سرگرم وابستگی ہے۔ ان کے کالم ہندستان کے متعدد اہم اخباروں میں ایک ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ دلی میں وائس آف امریکہ کے نمائندہ کے طور پر برسر کار ہیں۔ صحافت کے ساتھ ساتھ ان کے قلم سے تقریباً دو درجن کتابیں نکل کر شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں ان کے حج کے سفر نامے اور خاکے بھی شامل ہیں۔ ان کی اہم کتابوں میں میڈیا روپ اور بہروپ، مغربی میڈیا اور اسلام، احوال صحافت، مولانا محمد عثمان فارقلیط حیات و خدمات، اردو صحافت اور علما، دہلی کے ممتاز صحافی، باتیں اخبار نویسوں کی، پھر سوئے حرم لے چل، نقش برآب، بازیافت، مطالعات، عکس مطالعہ اور فرقہ وارانہ جنون وغیرہ جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔

سہیل انجم صحافت کے فن، تکنیک اور تاریخ سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے کالم حالات حاضرہ سے واقفیت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا بھی لطف دیتے ہیں اور اس حوالے سے ان کے بعض کالم یادگار ہیں۔ صحافت کی تاریخ و تہذیب پر ان کا نہ صرف مطالعہ وسیع ہے بلکہ ان کے اخذ کردہ نتائج بھی دوررس اہمیت کے حامل کہے جاسکتے ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں صحافت اور تاریخ صحافت سے تعلق رکھتی ہیں جن میں تاریخ بھی ہے اور تاریخ کا جائزہ بھی۔

سہیل انجم کی تحریریں پڑھ کر ان بزرگوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جن کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے کہ وہ صحافی ہیں یا ادیب۔ ان کی بے شمار تحریریں ہیں جن میں نثر کی متعدد اصناف کا احاطہ کیا گیا ہے۔ خاکہ نگار اور سفرنامہ نگار کے طور پر ان کی حیثیت مسلم ہے۔ ان تحریروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حالات وواقعات اور افراد وشخصیات کے تئیں ان کے مطالعہ ومشاہدہ کی جہت ان کے خلاقانہ مزاج وانداز کی غماز ہے۔ ''نقش برسنگ'' کے مطالعہ سے کچھ ایسا ہی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ کتاب ''خراج تحسین اور خراج عقیدت'' پر مبنی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ۲۶ افراد وشخصیات سے متعلق خاکے/مضامین شامل ہیں۔ کتاب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ذہن میں ایک خاکہ سہیل انجم کا بھی ابھرتا ہے جو جدوجہد اور عزم پیہم سے عبارت ہے۔ پرنٹ میڈیا سے الیکٹرانک میڈیا تک کے اس سفر میں کیسے کیسے ہفت خواں انھوں نے طے کیے ہیں اس کی کچھ کچھ جھلک ان خاکوں سے نمایاں ہوتی ہے۔ انھوں نے لکھنے سے کبھی ہار نہیں مانی۔ روزمرہ کے حالات، ملی اور ملکی مسائل اور اردو کے مسائل ومعاملات پر ان کی بے شمار تحریریں ہیں مگر ''وائس آف امریکہ'' سے تعلق کے بعد معیشت اور افراط زر پر رپورٹ پیش کر کے انھوں نے ثابت کر دیا کہ واقعی ''میں ایک صحافی ہوں، میرا ذریعہ معاش اور مشغلہ قلم کاری ہے''۔ ان کی یہی ہمہ رنگ تحریریں ان کے قارئین کا نہ صرف حلقہ وسیع کرتی ہیں بلکہ انھیں لوگوں کو اپنا گرویدہ بھی بناتی ہیں۔ ان کی شخصیت کا ایک جوہر جو اس کتاب سے نمایاں ہوتا ہے وہ ان کی تعمیری اور مثبت فکر ہے۔ زندگی کا ایک لمبا سفر انھوں نے تعمیری اور مثبت قدروں کے سہارے سے ہی طے کیا ہے۔ اپنے بزرگوں اور معاصرین کے کمال کا اعتراف بھی ان کی نمایاں خوبی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک طرف انھوں نے اپنے

بزرگوں اور معاصرین کو خراج تحسین پیش کیا ہے وہیں اپنے سے خردوں کی علم نوازی اور ادب دوستی کو بھی نمایاں کیا ہے۔ یہ کتاب ان کے ہمہ جہت تعلقات کی آئینہ دار بھی ہے۔ یعنی اس میں علمائے کرام، اردو صحافت سے وابستہ شخصیات، شاعر، ادیب، دانش ور اور اردو کے فروغ میں ہمہ وقت سرگرم رہنے والے افراد کا تذکرہ ہے۔ ''نقش بر سنگ'' زبان اور مذہب سے گہری وابستگی کا استعارہ بھی کہی جاسکتی ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے زندگی کے گوناگوں تجربے اور اردو صحافت کی وادی پرخار کے بہت سے راستے بھی دکھائی دیں گے۔ مولانا عزیز عمر سلفی کے خاکے میں ''گلی چاہ رہٹ'' کا تذکرہ اور اس کی تاریخ کے بیانیہ پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ مولانا کے گھر تک پہنچے کا راستہ جس طرح تاریک و نیم تاریک اور بند گلیوں سے دائیں بائیں ہوتے ہوئے بیان کیا گیا ہے وہ فرحت اللہ بیگ کے خاکے ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی'' کی یاد دلاتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے ''چوڑی والوں'' سے ''بتاشے والوں کی گلی'' تک کا راستہ جس طرح بتایا اور سمجھایا ہے مذکورہ خاکہ میں کچھ یہی انداز سہیل انجم کا بھی ہے۔

کتاب کا سب سے طویل خاکہ م۔ افضل کی شخصیت پر لکھا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے صحافت، سیاست اور سفارت کاری کے بہت سے ادب آداب سامنے آتے ہیں۔ البتہ م۔ افضل کا اردو صحافت سے اٹوٹ رشتہ ہی ان کی اصل پہچان ہے جسے خاکہ نگار نے واضح بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر شاہد پرویز کا خاکہ بھی طویل ہے۔ ان کو جاننے والے یہ گواہی دیں گے کہ وہ واقعی اچھے انسان اور اچھے صحافی ہیں۔ اس خاکے میں سہیل انجم صاحب کی دلی میں تگ و دو اور مسائل و مشکلات کے زمانے میں قلم کی مشقت کے بہت سے روپ دیکھے جاسکتے ہیں۔ مودود صدیقی کی شخصیت کا ایسا پیکر لفظوں میں ڈھالا گیا ہے کہ انھیں نہ دیکھنے والے بھی اٹھتے بیٹھتے دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی بے نیازی اور لوگوں کے کام آنے کا جذبہ واقعی بے مثال ہے۔ ایسے لوگوں پر شہر دلی کو فخر ہے۔ ڈاکٹر سید احمد خاں بنیادی طور پر حکیم ہیں۔ ان کی مسیحائی میں ان کے حسن سلوک کو زیادہ دخل ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ اردو زبان ان کا اوڑھنا اور بچھونا ہے۔ پروفیسر شہپر رسول (ایک بے نیاز شخص) کا خاکہ بنیادی طور پر ایک شریف اور

نیک طینت شخصیت کے ذکر سے عبارت ہے، جس نے پروپیگنڈے سے خود کو دور رکھا۔ اس خاکہ کے مطالعہ سے ادبی معاملات کے آداب سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ شفیق الحسن اور اویس سنبھلی کی کاروباری سرگرمیوں سے ان کے علمی و ادبی شغف کا بیان ہم سب کے لیے قابل رشک ہے۔ یہ دونوں خاکے سہیل انجم کی محبت اور اپنائیت کے آئینہ دار ہیں۔ خیال رہے کہ یہ دونوں اپنے آپ میں صرف ایک جوہر قابل ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے یہاں اعلیٰ انسانی اور اخلاقی قدروں کا پاس ولحاظ بھی ہے۔ یہ بات خاکہ کے بین السطور سے بھی نکلتی ہے۔ ایک خاکہ جناب انجم نعیم کا ہے۔ چھوٹی مشین کا بڑا پرزہ کے عنوان سے۔ تعلقات وعنایات کی چاشنی میں ڈوبا ہوا یہ خاکہ ان لوگوں کے لیے اور بھی پر لطف ہے جو انعیم نعیم کی تحریریں پڑھتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر احمد علی برقی کا خاکہ نہ صرف ان کا تعارف کراتا ہے بلکہ ایک مصرعہ میں ان کی شخصیت کا عطر پیش کر دیا گیا ہے۔ یعنی ''نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ''۔

خراج عقیدت میں جو شخصیات شامل ہیں ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی خدمات کے سبب علمی اور ادبی منظرنامے کا روشن چہرہ تھے اور بعض وہ لوگ ہیں جن کی شہرت ومقبولیت تو نہیں لیکن بہ حیثیت انسان وہ بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری، مولانا عبدالوہاب خلجی، حفیظ نعمانی، پروفیسر اشتیاق دانش، مولانا عمید الزماں کیرانوی، رضوان احمد اور حنیف ترین کو جاننے والے بہت ہیں مگر کتاب میں نعمان فاروقی، نزاکت علی خاں، مولانا عطاء اللہ خاں وغیرہ کے نام بھی شامل ہیں جن کے خاکوں سے ان کی زندگی اور انسانیت نوازی کے بہت سے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

سہیل انجم کا انداز واسلوب جگہ جگہ دامن دل کو کھینچتا ہے۔ ان کی شگفتہ بیانی نہ صرف لطف دیتی ہے بلکہ ناملائم باتوں کو بھی گوارا بنا لیتی ہے جس کی مثالیں بہت کم ہیں۔ مرحومین کے خاکے لکھنا آسان ہے مگر زندوں پر لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ مگر اس مشکل کو انھوں نے آسان کر رکھا ہے۔ سہیل انجم کی دیگر کتابوں کی طرح امید ہے یہ کتاب بھی مقبول ومشہور ہوگی۔

☆......☆......☆

مسافرانِ آخرت

مولانا عبدالرزاق لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے قدیم استاذ حضرت مولانا عبدالرزاق لدھیانوی دو ماہ علالت کے بعد ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۳ھ مطابق ۲۸ دسمبر ۲۰۲۱ء کو تقریباً ۸۲ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ آپ جامعہ علوم اسلامیہ کے ان چند اساتذہ میں سے تھے جن کی عمر کا نصف صدی سے زیادہ عرصہ جامعہ کی خدمت میں گزرا اور جامعہ ہی سے ان کا جنازہ اٹھا۔ آپ طویل عرصہ جامعہ میں تدریس کے علاوہ دیگر خدمات بھی انجام دیتے رہے، آپ کچھ عرصہ ماہنامہ بینات کے ناظم بھی رہے۔ آپ کی تواضع، خودداری، قناعت پسندی اور تقویٰ کے بے شمار واقعات ہیں، جن کی بنا پر برملا کہا جاسکتا ہے کہ آپ صحیح معنوں میں "اسلاف کی یادگار" تھے۔ تواضع وخودداری ایسی کہ آخر عمر تک سینکڑوں طلبہ کے ہوتے ہوئے گھر کا سودا سلف خود لانے کا معمول رہا، قناعت پسندی ایسی کہ کپڑوں کے دو جوڑوں سے زیادہ کپڑے گوارا نہیں، احتیاط اتنی کہ جامعہ کی طرف سے اساتذہ کے وظائف بڑھائے گئے تو آپ نے اضافہ واپس کردیا اور کبھی وہ اضافہ قبول کرنے کے روادار نہ ہوئے۔

آپ کی پیدائش ۱۹۴۲ء میں لدھیانہ (بھارتی پنجاب) میں ہوئی، چھ ماہ کی عمر میں والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، پھوپھی صاحبہ نے پرورش کی، پاکستان بننے کے بعد اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ہجرت کی اور گجرانوالہ میں مقیم ہوئے، اسکول کی ابتدائی تعلیم کے بعد جامعہ نصرۃ العلوم گجرانوالہ سے دینی تعلیم کا آغاز ہوا، تمام کتب وہیں پڑھنے کے بعد محدثِ عصر حضرت بنوریؒ سے دورۂ حدیث پڑھنے کے لیے کراچی تشریف لائے، ۱۹۶۴ء میں سندِ فراغت حاصل کی اور جامعہ میں ہی مدرس مقرر ہوئے اور پھر ہمیشہ کے لیے جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے ہو کر رہ گئے۔

آپ کی نمازِ جنازہ آپ کے صاحبزادے اور جامعہ کے استاذ مولانا محمد طیب لدھیانوی کی اقتدا میں ادا کی گئی بعد ازاں ڈالمیا قبرستان میں سپردِ خاک کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ کامل مغفرت فرمائے۔

ناقابلِ فراموش تحریروں کا سدا بہار مجموعہ

(اکابر علماء کی نظر میں)

یہ معلوم ہو کر خوشی ہو رہی ہے کہ محترم مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مجلہ النخیل کا ''مطالعہ نمبر'' شائع فرما رہے ہیں، جس میں برصغیر کے مشہور اہلِ قلم حضرات کے ذوقِ مطالعہ و کتب بینی اور انتخابِ کتب وغیرہ سے متعلق وقیع اور گراں قدر معلومات جمع کی گئی ہیں۔ مولانا محترم کی یہ کوشش لائقِ ستائش اور قابلِ قدر ہے۔ امید ہے کہ یہ خصوصی شمارہ ایک قیمتی دستاویز اور نئی نسل کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

مفتی ابوالقاسم نعمانی

مہتمم دارالعلوم دیوبند

''النخیل'' کا ''مطالعہ نمبر'' متقاضی وقت بھی ہے اور ایک نہایت لائقِ قدر و ستائش کاوش بھی۔۔۔ راقم السطور بصمیم قلب بارگاہِ رب العزت میں دعا گو ہے کہ حق تعالیٰ آپ محترم اور جملہ شرکائے کار کی ان مخلصانہ جہود کو بار آور فرمائیں اور اس کے ثمر آور اور متوقع مثبت نتائج سے امت مسلمہ کو بالعموم اور نسل نو کو بہرہ ور فرمائیں، آمین یا رب العالمین

مولانا محمد سفیان قاسمی

مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند

مجھے یہ معلوم ہو کر نہایت مسرت ہوئی کہ آپ اپنے ماہ نامہ ''النخیل'' کا ''مطالعہ نمبر'' منظرِ عام پر لا رہے ہیں، امید ہے کہ آپ کے اس خصوصی دستاویزی اور عالمی و معیاری شمارے سے علم و کتاب سے واسطہ و رابطہ رکھنے والوں کو مزید رہنمائی حاصل ہوگی۔

مولانا محمد سعیدی

ناظم مظاہر علوم (وقف) سہارنپور

''یادگارِ زمانہ علمی شخصیات کا احوالِ مطالعہ'' کے عنوان سے (یہ مجموعہ) شائع کرنے کی عمدہ کاوش کی ہے۔ امید ہے کہ ڈیجیٹل دنیا کے اس دور میں طلبہ کے لیے یہ علمی کاوش نہایت مفید ہوگی اور مطالعہ کے ختم ہوتے ذوق میں روح پھونکنے کا کام کرے گی۔ ان شاء اللہ۔۔۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے نامور و ماہر ادیب، صاحبِ قلم مولانا ابن الحسن عباسی اور ان کے رفیق خاص مولانا بشارت نواز اور دیگر رفقا کو کہ اس کام کو وقت کی ضرورت سمجھتے ہوئے انہوں نے کامیاب کوشش کی ہے۔

مولانا غلام محمد وستانوی

رئیس جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا

مطالعہ سے بیزاری کے ایسے عمومی ماحول میں علم و مطالعہ کی صدا یقیناً سناٹے میں آواز پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را کے مصداق بندہ آپ کی اس متوقع اشاعت کو جرسِ کارواں کے طور پر دیکھتا ہے اور دعا گو ہے کہ حق تعالیٰ شانہ ''النخیل'' کے ''مطالعہ نمبر'' کو قبولیتِ تامہ اور مقبولیتِ عامہ سے سرفراز فرمائے۔

مولانا خالد سیف اللہ گنگوہی نقشبندی

(مدیر) جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ

عموماً میدانِ علم کے نوواردان مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ مطالعہ کیسے کریں؟ کیا مطالعہ کریں؟ مطالعہ کرنے کے بعد کچھ یاد نہیں رہتا، اسے ذہن نشین کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ مطالعہ کے بعد لکھنے کا آغاز کیسے کریں؟ تحریر کو مؤثر، شستہ اور رواں کیسے بنائیں؟ تصنیف و تالیف کی مشق کیسے کریں؟ وغیرہ۔ امید ہے، النخیل کی یہ خصوصی اشاعت ان کے ان تمام سوالات اور ان جیسے دیگر بہت سے سوالات کے جوابات فراہم کرے گی۔

ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی

سیکریٹری جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

مجلس تراث الاسلام، سلیم ہاؤسنگ سوسائٹی، شاہ فیصل ٹاؤن نمبر 3، کراچی
فون نمبر: 0300-4097744, 0344-4023470
ای میل: alnakhil786@gmail.com